چنگاری

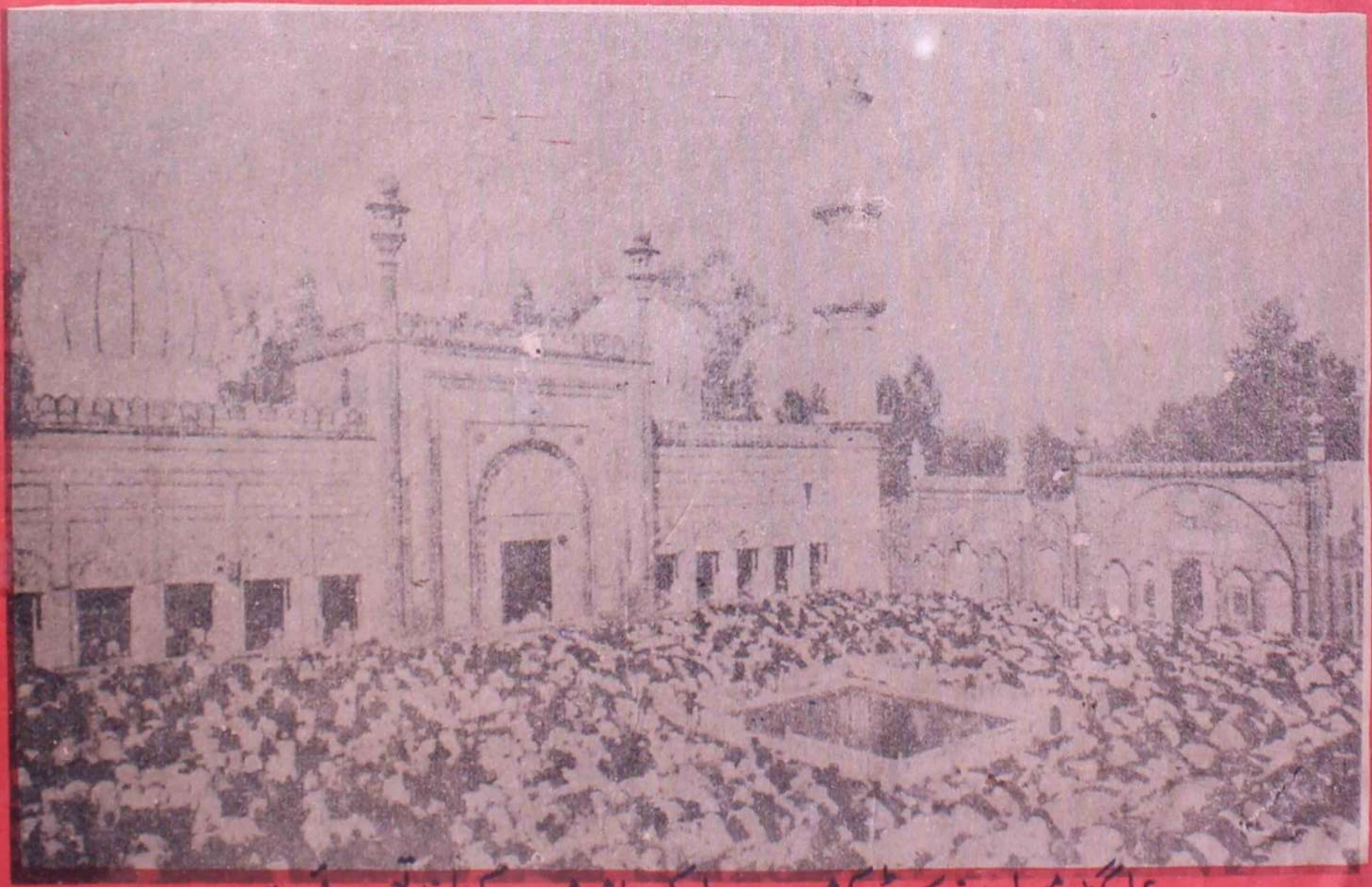

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مسجد جو دہلی کی جامع مسجد کے طرز پر تعمیر ہوئی ہے

پندرہ روزہ
چنگاری
دہلی

اداریہ

ہندوستان میں کروڑوں لوگ غذا کی کمی کی وجہ سے بیماریوں کا شکار ہیں۔ دوسرے ملکوں میں لوگ سبزی کے ساتھ روٹی کھاتے ہیں ہمارے یہاں روٹی کے ساتھ سبزی کھائی جاتی ہے یعنی یہ کہ ہم اناج زیادہ کھاتے ہیں اور گوشت یا سبزی کم جب کہ دوسرے ملکوں میں لوگ سبزی اور گوشت زیادہ کھاتے ہیں اور اناج کم اس لئے کہ انسانی جسم کو صحت مند رکھنے کے لئے اناج سے زیادہ گوشت اور سبزی کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ معمولی کپڑے پہنتے ہیں۔ معمولی جوتے استعمال کرتے ہیں اور پھل تو زیادہ تر لوگوں کو صرف بیماریوں میں ڈاکٹر کے مشورے پر دیا جاتا ہے۔ ہماری تمام اچھی چیزیں باہر بھیج دی جاتی ہیں ہم انھیں بیچ دیتے ہیں۔ ہم اپنی ہر اچھی چیز بیچ دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنا اچھا دماغ بھی فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ جو دوسرے ملکوں میں اپنے ڈاکٹر، انجینیر، اور دوسرے ماہرین ہیں جن کی تعلیم و تربیت پر اس ملک کا کروڑوں روپیہ خرچ ہوا ہے ہم انھیں بیچ ہی تو رہے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ ہم ننگے، بھوکے، مفلس اپنے شاندار ماضی کے گن گان میں مصروف رہتے ہیں یا پھر دنگے فساد سے شغل فرماتے ہیں۔ ہمارے زیادہ تر اخبارات سنسنی خیزی، اسکینڈل اور اس طرح کی ہوائی باتوں میں مصروف ہیں۔ اپوزیشن کا کہنا ہے کہ اس ملک کی حالت تبھی سدھرے گی جب اقتدار ان کے حوالے کر دیا جائے۔ اس لئے کہ اس ملک میں جو ایسی ہزاروں خرابیاں ہیں جن کو اقتدار میں آئے بغیر بھی ٹھیک کیا جا سکتا ہے انھیں ان سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ انھیں تو صرف اقتدار چاہیئے تاکہ وہ جوتیوں میں دال بانٹ سکیں۔ چرن سنگھ کسانوں کی ریلی کرتے ہیں تو اندرا جی ان سے بڑی ریلی کر دیتی ہیں۔ ہمارے دانشور کبھی کانگریس کی تعریف کرتے ہیں کبھی اپوزیشن کی۔ مگر دانشور تو صرف قلم کے مجاہد ہیں۔

ہندوستان کی قسمت صرف وہ لوگ سنوار سکتے ہیں جو موجودہ نظام کے خلاف ہیں اور ایک نئے نظام کے حامی۔

اس شمارے میں

آپ کا خط ملا — قارئین
رونق، ستی — رئیس مرزا
تازہ بہ تازہ نو بہ نو — ادارہ
خواجہ عبدالغفور، اکبر الہ آبادی، انجم مانپوری، اقبال، مجید لاہوری، شوکت تھانوی
راجہ مہدی علی خاں، جوش ملیح آبادی، ضمیر جعفری، گوپی ناتھ امن، دلاور فگار
کنھیا لال کپور، رضا نقوی واہی، صادق مولیٰ۔ (مزاحیہ کلام)
سر سید سے انٹرویو — بشیر احمد
گہوارۂ دانش — بشیر احمد
نظمیں — اندر سروپ دت ناداں
ڈاکٹر محمد یعقوب عامر
مزاحیہ کلام کا انتخاب — ادارہ
جاپان چلو — مجتبیٰ حسین
کتابوں کی باتیں — بشیر احمد
لندن کا مشاعرہ — عزیز الدین احمد لندن
بات کا بتنگڑ — معین اعجاز
کچھ ہنسنے — قارئین
میلہ گھومنی (افسانہ) — علی عباس حسینی
پرکھ — فلمی مبصر

مدیر۔ جمیل احمد
ادبی حصے کی ترتیب۔ بشیر احمد — حسن کار۔ باسط ہاشمی
جلد۔ ۱ شمارہ۔ ۷ — قیمت۔ ۱/۵۰ — سالانہ۔ ۳۰ روپے
پتہ۔ 1410/3 رام نگر شاہدرہ۔ دہلی 110032
مطبع۔ جے کے آفسٹ پرنٹرس۔ دہلی ۶۔ اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی ۶
جمیل احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلیشر نے مذکورہ پریسوں میں چھپوا کر 1410/3 رام نگر شاہدرہ دہلی سے شائع

آپ کا خط مِلا

● عزیزہ جمیلہ احمد صاحبہ سلمہا - دُعائیں

چنگاری کا ساحر نمبر ملا - بہت پسند آیا - پُرانے افسانوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی بہت مناسب ہے - "گاہے گاہے باز خواں" بہت ضروری ہے - اگلے شمارہ کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں - اس میں "انگارہ" کا احیار جو ہونے والا ہے - ترقی پسند مصنّفین کی یہ پہلی جرأت مندانہ پیش کش تھی - اُس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں بنّے بھائی کے چھوٹے بھائی باقر ظہیر اور میں نے مل کے بڑی تعداد میں اس کی کاپیاں بیچی تھیں قیمت غالباً ایک روپیہ تھی - اور اس کے چند ہی دن بعد کتاب "انگارہ" بحق سرکار دولت انگلیشیہ ضبط قرار پا گئی تھی - اس کے بعد بھی خفیہ طور پر ہم لوگوں نے اس کی مزید کاپیاں فروخت کیں - آپ کے اس اعلان نے اُن دنوں کی یاد تازہ کر دی -

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی اور مجھ کو چنگاری بھیجنا نہ بھولیں گی -

خیر اندیش

وامق جونپوری

● چنگاری کا نیا شمارہ ملا -

اس سے پہلے یہ رسالہ نہیں ملا تھا - پرچہ پسند آیا -

بھائی! شمارہ نمبر تو کہیں پر دے دیا کیجیے تاکہ اگر کچھ رائے لکھی جائے تو پتہ چل سکے کہ کس شمارے پر رائے دی جا رہی ہے -

آہنگ بھیجا جا رہا ہے -

کلام حیدری

● کتابت و طباعت قابلِ اطمینان ہے - ضخامت کے لحاظ سے قیمت مناسب ہے - سرِ ورق ساحر لدھیانوی مرحوم کی نمایاں تصویر بہت پسند آئی - اس تصویر نے پورا سرِ ورق کور کر لیا ہے - رسالے کا نام بھی اگر دے دیا گیا ہوتا تو گٹ اپ میں مزید اضافہ ہو جاتا -

ساحر مرحوم کی نظم پرچھائیاں کا انتخاب بہت مناسب ہے - اوپر اوپر حالات بدلے ہیں لیکن پس پردہ عام آدمی کے اِرد گِرد وہی کربناک ماحول ہے جسے دیکھ کر ساحر مرحوم نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا:

گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

جناب مجتبیٰ حسین کا سفرنامہ "جاپان چلو" تعریف کا مستحق ہے - طنز و مزاح کے پس پردہ موجودہ معاشرے اور موجودہ نظام پر ان کا ہلکا پھلکا وار بھی مہلک محسوس ہوتا ہے اِسے جاری رکھیے -

"ہم خلاف ہیں" عُنوان کے تحت ہندوستان کے بگڑتے ہوئے معاشی، اقتصادی اور سماجی حالات اور ان کے اسباب پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہے - اس کا تدارک مایوسی سے نہیں ہوگا - یہ لکھ کر آپ نے اُن لوگوں کو جھنجھوڑا ہے جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہیں - اس کے لئے دلی مبارک باد -

پاکستان کے بارے میں جو مضمون شامل ہے، اس میں وہاں آئے دن ہونے والی سیاسی اُتھل پتھل پر خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی ہے جو وہاں کے موجودہ حالات کو سمجھنے میں مددگار و معاون ثابت ہوگی - دیگر اسلامی ممالک کے حالات و کوائف کے بارے میں بھی اچھے اور مفید مضامین شامل کئے جائیں تو بہتر ہوگا -

ادبی حِصّہ ہنوز قابلِ توجہ ہے - افسانوں میں 'کفن' اور 'تین پیسے کی چھوکری' کا انتخاب عمدہ ہے - آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ان افسانوں نے ملک بھر سے خراجِ تحسین وصول کیا تھا - 'اوراقِ پارینہ' سے ایک ہی افسانہ لیا جائے تو بہتر ہوگا تاکہ چنگاری کے قارئین، نئی نسل سے بھی روشناس ہو سکیں -

ادبی حصے میں غزلوں، نظموں اور تنقیدی مضامین کو بھی جگہ ملنا چاہئے - اپنے انھیں مختصر الفاظ کے ساتھ 'چنگاری' کی کامیابی اور مقبولیت کے لئے ہم دست بدعا ہیں

حسن نجمی سکندر پوری

● آپ کے دو شمارے میرے سامنے ہیں - لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا، کہ پہلا شمارہ کون سا ہے دوسرا کون سا ہے - ایک پر ساحر مرحوم کی تصویر ہے - اشاعت کی تاریخ تو الگ بات رہی - رسالے کا نام بھی نہیں ہے - دوسرے رسالے میں بھی تاریخ اشاعت باوجود تلاش کے نظر نہ آ سکی - ہو سکتا ہے - کسی صفحہ پر میری نظر نہ پڑ سکی ہو - جناب آج کی دُنیا میں دیدہ زیبی بڑی چیز ہے - رسالے میں چھپائی بہت خراب ہے ان سب باتوں کے اس کی انفرادیت مسلم ہے -

بلا تکلف کہا جا سکتا ہے - کہ رسالہ اس معیار پر کما حقہ پورا اُتر رہا ہے، جو ایک اُردو رسالے میں ہونا چاہیئے - بلکہ یوں بلا جھجک کہا جا سکتا ہے - اس رسالے (چنگاری) نے اُردو ادب کی چھپی ہوئی چنگاری کو سُلگا کر اردو ادب کو روشن کر دیا ہے -

محترم - اور اس کو خوب سے خوب تر بنانے کی سعی پیہم جاری رکھئے - یہ قدم آپ کا اردو دنیا پر بڑا کرم ہی نہیں بلکہ احسان ہوگا - تمام مضامین اپنی جگہ منفرد ہیں - مگر مجھے مجتبیٰ حسن صاحب کا جاپان چلو بے حد پسند آیا - کیا زبان، کیا استعارے استعمال کئے ہیں - دوستوں کی اور اپنی تصویر کس خوبصورتی سے بالکل نفسیاتی طور سے مجتبیٰ صاحب نے کاغذ پر بکھیر کر زمانہ کے دوستوں کے ذہنوں کی عکاسی کی ہے -

وزیر جنیں شہر یار جاں کے مصداق لکھنے والے بھی ایسے ہی رہ گئے - یا مجبوراً بن گئے جیسے سُننے والے - خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا - جناب میری رائے ہے - گر قبول افتد زہے عز و شرف والا معاصرین جاگے انٹرویو اچھی شخصیت کا چھاپئے -

یعقوب خاں

رئیس مرزا

رونقِ ہستی

سونال مان سنگھ ہمارے دیش کی ایک ایسی حسین رقاصہ ہیں جنھیں بھارت ناٹیم اور اڑیسی دونوں ہی طرح کے رقص میں کمال حاصل ہے اور ان دونوں رقصوں رقصوں کو وہ جس طرح پیش کرتی ہیں اُسے دیکھ کر ایک ایسا شخص بھی مبہوت ہو جاتا ہے جو فنِ رقص سے نا واقف ہے۔

یہ دونوں رقص ہندوستان کے دو الگ الگ حِصّوں سے تعلّق رکھتے ہیں۔ بھرت ناٹیم کا تعلّق تامل ناڈ سے اور اڑیسی کا اڑیسہ سے ہے۔ دونوں کے لباس میں بھی فرق ہے۔ اور سنگیت بھی دونوں کا الگ ہے۔ لیکن سونال مان سنگھ کے لئے یہ فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ انھیں تال اور ابھی نئے دونوں پر قدرت حاصِل ہے اور ایک طرح سے وہ تامل ناڈ اور اڑیسہ کو اس طرح ملا دیتی ہیں کہ دیکھنے والے کو اُن کے رقص میں ایک اچھوتے ہندوستان کی تصویر نظر آتی ہے۔

سونال مان سنگھ دلّی میں رقص کا ایک اسکول بھی قائم کرنا چاہتی ہیں۔

سونال کا تعلّق گجرات کے ایک ایسے گھرانے سے ہے جس نے آزادی کی ہماری جنگ میں بڑھ چڑھ کر حِصّہ لیا۔ وہ مسٹر منگل داس پکوا سا کی پوتی ہیں جو بمبئی کے گورنر بھی رہ چکے ہیں۔ اس خاندان کا مہاتما گاندھی سے گہرا تعلّق رہا ہے اور شائد اسی وجہ سے سونال میں مہاتما کی انکساری موجود ہے۔

دنیا کا شائد ہی کوئی بڑا ملک ایسا ہو جہاں سونال مان سنگھ نہ گئی ہوں اور جہاں کے عوام کو انھوں نے ہندوستانی رقص کا عاشق نہ بنا دیا ہو۔

اندر سروپ دت نادان

فسادی

تھا سر پہ سورج
مگر اندھیرا
نہ جانے آکر کہاں سے میرے قریب کوندا
پھر ایک نیزہ
نگاہ قاتل کی آگ پی کر
ہوا میں اچھلا
صدائے قاتل کی گھن گرج نے
پھر آبروئے سکوت لوٹی
"تجھے نہ چھوڑوں گا آج زندہ!
مجھے فسادی سمجھ کے شائد ہوا ہے تیرا مزاج برہم
مگر میں مقصد سخن ہوں بھائی . . . . .
میرے تکلم سے درد پھوٹا
"تو کون ہو تم ؟"
زبان قاتل سے تیر پھوٹا
"میں شہر محبت کا بانکپن ہوں
میں راندۂ محفل سخن ہوں
میں گیت گاتا ہوں زندگی کے
بشر کی عظمت کے روشنی کے
میں شہرِ ذلّت کی ہر گلی سے گزر چکا ہوں
میں اس خدا کو بھی جانتا ہوں
جو تیرے نیزے میں جلوہ گر ہے
وہ شخص بھی ہے میری نظر میں
جو تیرے اندر
محبتوں کے چراغ لے کر
نہ جانے کب سے بھٹک رہا ہے
وہ نیک انساں !
جو میرے گیتوں کا دیوتا ہے
ابھی ادھورا تھا گیت میرا
کہ چشم قاتل سے اشک ڈھلکے
ہوئے حمائل میرے گلے میں وہ دست و بازو
جو شہرِ ذلّت کی آبرو تھے . . . . . .
ہزار بل کھا کے رہ گیا وہ مہیب نیزہ
خدائے وحشت نے ڈرتے ڈرتے یہ آدمیت کا
جشن دیکھا !
عظیم سورج کی روشنی میں ہوا اجالا نہ

بشیر احمد

گہوارۂ علم و ادب

علیگڈھ مسلم یونیورسٹی نے اپنی صد سالہ تاریخ میں بے شمار علم کی شمعیں روشن کیں ہیں۔ اس کے فرزند ہر شعبۂ زندگی میں ستاروں کی طرح روشن ہیں کتنے ہی سیاس، ڈپلومیٹ، عالم، افسانہ نگار، شاعر، ناقد، موسیقار، مصوّر، اس گہوارے سے ابھرے ہیں ان میں سے بعض قومی اور کئی بین الاقوامی حیثیت کے حامل

● ڈاکٹر ذاکر حسین

ہیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی جب قایم ہوئی اس وقت قومی تحریک شباب پر تھی انگریز ہندوؤں سے ناراض تھا۔ اس لیے کہ راجہ رام موہن رائے اور کئی دوسرے دانشوروں کی طرف سے ہندستانی قومیت کی بیداری اور خاص طور پر ہندوؤں کی اصلاح کے لیے جو جدوجہد ہوئی تھی اس کے نتیجے میں ہندو اور خاص طور پر بنگال کے ہندو تعلیم کے میدان میں کافی آگے بڑھ آئے تھے۔ انگریز حکمراں طبقے نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے انگریزی تعلیم کی توسیع پر بھرپور توجہ دی تھی اس لیے کہ انہیں بابوؤں کی ضرورت تھی۔ خاص طور پر ہندو بابوؤں کی اس لیے کہ مسلمانوں کا اوپری طبقہ انگریزوں سے ناراض تھا، ناراضگی کی وجہ بھی معقول تھی انگریزوں نے ان سے اقتدار چھینا تھا۔ مسلم بالائی طبقے کے وکیل علما کا غصہ تو اور زیادہ تیز تھا وہ انگریزوں کو نکالنے کے لیے مسلسل جدوجہد میں مصروف تھے۔ انگریزوں کو نجس قرار دے دیا گیا تھا ان سے ہاتھ ملانا بھی ناپاکی کے مترادف تھا۔ ایسی صورت میں انگریز نے ہندوؤں کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف انگریزوں کے انسان دوست

● ایوب خاں

حلقوں نے انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو خاص طور پر بنگال کے ہندوؤں کا اوپری طبقہ انگریزی تعلیم کی دولت سے مالا مال ہو کر خود انگریزوں کے خلاف برسر پیکار ہو گیا۔ یہ دیکھ کر انگریز حکمران طبقہ نے اپنی پالیسی بدلی اور مسلمانوں پر نظر عنایت شروع کی اتفاق سے سرسید احمد خاں مسلمانوں کی اصلاح کے لیے آمادہ جہاد

● شوکت علی، محمد علی

تھے، مگر انھیں ہندو اصلاح پسندوں سے زیادہ مشکلات کا سامنا تھا سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مسلمانوں کا اوپری طبقہ (اشرافیہ) اس بات کے لیے بالکل تیار نہ تھا کہ مسلمانوں میں تعلیم عام ہو وہ کہتے

● راس مسعود

تھے۔ اگر ہر آدمی تعلیم یافتہ ہو جائے گا تو ان کی غلامی کون کرے گا۔ ان کے پنکھے کون کھینچے گا۔ دوسری طرف علماء کرام تھے ان کا خیال تھا کہ انگریزوں سے کسی قسم کا کوئی ربط نہیں رکھا جائے۔

● شیخ عبداللہ

میں انھوں نے جو مشقت کی اس کا تصور بھی محال ہے۔ پھر آئین اکبری کی تدوین کے تعلق سے غالب کے مشورے نے ان کا رخ حال کی طرف کیا اور جب وہ اس طرف متوجہ ہوئے تو دیوانوں کی طرح کام کیا۔ گالیاں سنیں، جوتے باری کا مقابلہ کیا، طعنے سہے، مگر منہ نہ موڑا ان کی کوششوں سے ان کے ارد گرد ذہین اور مخلص شخصیتوں کا ایک ہالہ سا بن گیا تھا۔ حالی، محسن الملک شبلی ان کے روشن ستارے تھے۔ انگریزوں کے حکمران طبقہ نے کچھ اپنی مصلحتوں اور انگریزوں کے

انسان دوست حلقہ نے اپنی انسانیت کے ناطے سرسید کی مدد کی حکمران طبقہ کی ڈانٹ اور دباؤ نے مسلم اشرافیہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف سرسید کو چندے دیں اس طرح سے ۱۸۷۵ء میں سرسید نے علیگڈھ میں اسکول قایم کیا جو ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء

فیصد طلبا غیر مسلم ہیں۔ علی گڑھ مسلم میں دس ہزار سے زیادہ طلبا ہیں سے تقریباً ۶۵۰۰ یونیورسٹی میں ہ

● سلیم، جاوید

● حسرت موہانی

● مولوی عبدالحق

● پروفیسر ہارون خاں شیروانی

● نواب چھتاری حافظ سعید خا

تیسری طرف مسلمانوں کا نچلا طبقہ تھا جن میں سے زیادہ تر کے آباو اجداد پسماندہ ہندو طبقہ سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے کبھی خواب میں بھی تعلیم حاصل کرنے کا خیال نہیں کیا تھا۔ ایسی صورت میں تعلیم اور خاص طور پر انگریزی تعلیم عام کرنے کا خیال دیوانے کے خواب کے علاوہ کچھ نہ تھا مگر سرسید دھن کے پکے تھے ایک زمانہ تھا جب ان کا رخ ماضی کی طرف تھا آثار الصنادید کی تیاری

میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج بنا اور یکم دسمبر ۱۹۲۰ء کو مسلم یونیورسٹی کا مقام حاصل کیا۔ (سرسید کی شخصیت اس انٹرویو سے بہت اچھی طرح نمایاں ہے جو اسی شمارے میں شامل ہے۔)

ایم اے او کے قیام میں ہندو مسلمان دونوں فرقوں نے چندے دیے تھے۔ طلبا اور اساتذہ میں ہندوؤں کی بڑی تعداد شامل تھی۔ آج بھی ۳۵

کرتے ہیں۔ طلبا کے لیے ۸ ہال ہیں اور ط کے لیے دو لڑکیوں کی تعداد ڈیڑھ ہزا زیادہ ہے۔ ان میں سے ۴۰ فیصد اعلیٰ حاصل کر رہی ہیں۔ یہاں علیحدہ تعلیم ساتھ ساتھ مخلوط تعلیم بھی جاری ہے۔

علیگڈھ مسلم یونیورسٹی مرکزی سرکار کے زیر ہے اس کا سالانہ بجٹ تقریباً ۶ کروڑ۔ یہاں ہر ریاست کے طلبا ہیں۔ ان کے علا تقریباً ۳۰ بیرونی ملکوں کے ۳۰۰ سے زی

ما یہاں زیرِ تعلیم ہیں۔ عالمِ اسلام میں
یونیورسٹی بے مثال ہے۔ مثلاً قاہرہ کا

● رفیع احمد قدوائی

دینی تعلیم کے لیے مشہور ہے۔ علیگڈھ مسلم
ٹی اپنی سیکولر اور سائنٹیفک علم کیلیے ممتاز ہے۔
گزشتہ دس برسوں میں یہاں سے
سے زیادہ طلبا اور طالبات نے پی ایچ
کیا ہے ان میں ۳۶۰ نے سائنس میں ڈاکٹری
لی ہے اس نے جغرافیہ، کیمیا، بایوکیمسٹری
اور دوسرے کئی علوم میں امتیازی مقام
ل کیا ہے۔ اس نے فلسفہ اسلام، اسلامی

تاریخ کے شعبوں پر بھی خاص توجہ دی ہے
اس کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے مگر تہذیبی

● لیاقت علی خاں

زبان اردو ہے۔ اس نے ادب و تہذیب کا ایک معیار قایم کیا ہے۔ اس یونیورسٹی کا ترانہ مشہور شاعر مجازؔ نے تشکیل دیا تھا مسلم تہواروں کے علاوہ دیوالی اور ہولی بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ اس کی مسجد جو دہلی کی جامع مسجد کے طرز پر بنی ہے۔ شیعہ سنی دونوں کی عبادت گاہ ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے سب سے پہلے

سمسٹر سسٹم شروع کیا اس نے انتظامیہ میں طلبا کی شرکت، ضابطہ اخلاق پر زور اور اسی طرح کے کئی معاملوں میں امتیازی مقام حاصل کیا ہے۔ اس کے طلبا سماجی بہبود میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔

● خان عبدالغفار خاں

یہاں کی اسٹوڈنٹ یونین ۱۸۸۳ء میں قایم ہوئی یہاں کے طلبا کی کردار سازی میں یونین کا زبردست حصہ ہے یہ اپنی آمدنی کا ۶۰ فیصد حصہ کم آمدنی والے والدین کے بچوں کی تعلیم پر صرف کرتی ہے۔ ●●

سرسید کی علی گڑھ تحریک
سویں صدی کے آغاز میں کئی اہم
ویکو جنم دیا یا ان کی سرپرستی کی۔
لیں سماجی، سیاسی، تعلیمی اور
، الغرض ہر میدان سے تعلق رکھتی
ں، خود سرسید نے تہذیب و معاشرت
ملاح کے ساتھ ساتھ عقلیت
دی اور لبرل ازم کی جس تحریک کو
غ دیا اور جس کی بہترین نمائندگی حالی
ی وہ اپنے سماجی کردار اور ذہنی رویے
عتبار سے ایک ترقی پسند تحریک تھی
ہیں بندھے ٹکے فرسودہ عقائد اور
ر رواج سے انحراف اور بغاوت کے
می تھے۔ اسی لیے بعد میں مولانا محمد علی

علی گڑھ اور ترقی پسند تحریک

اور دوسرے باغی نوجوان سرسید ہی کو اپنے باغیانہ خیالات کا سرچشمہ اور منبع کہتے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم، حسرت موہانی، راجہ مہندر پرتاپ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو قاضی عبدالغفار اور ڈاکٹر اشرف یہ سب علیگڈھ کے فرزند تھے اور سب نے ادب اور سیاست میں نئے باغیانہ خیالات کے بیج بوتے علیگڈھ کے جیالے کھلنڈروں نے ہی خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے دور میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ علیگڈھ میں اگر ایک طرف انگریزوں

کی بوئی ہوئی فرقہ پرستی اور سیاسی رجعت پسندی برگ و بار لا رہی تھی تو دوسری طرف برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کی چنگاریاں بھی یہیں سے نکل کر سارے ملک میں قوم پرستی اور سامراج دشمنی کی آگ لگا رہی تھیں۔ مسلم یونیورسٹی کے آفتاب ہاسٹل میں رہنے والے طلبا اب مارکسزم اور کمیونزم کا مطالعہ بھی کر رہے تھے۔ ان میں علی سردار جعفری، اختر حسین رائے پوری سبط حسن، ممتاز حسین اور شاہد لطیف بھی تھے اور عصمت چغتائی بھی۔ ان کے علاوہ جاں نثار اختر، اسرار الحق مجاز

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

پاکستان سول اور فوجی نوکر شاہی کی گرفت میں

گزشتہ قسطوں میں اس پر روشنی ڈالی گئی کہ کس طرح سے قیام پاکستان کے فوراً بعد پاکستان کے اقتدار پر سول نوکر شاہی نے قبضہ جمانا شروع کیا فوجی نوکر شاہی برسر اقتدار آئی۔ اب آگے ملاحظہ کیجیے یہ مضمون ان پاکستانی باشندوں کی تنظیم نے پیش کیا ہے جو جرمنی میں پروگریسو پاکستانیوں کی تنظیم کے نام سے کار ہے۔ ہم پہلی بار اسے ہندوستان میں پیش کر رہے ہیں۔ سنجیدہ مطالعہ کرنے والوں کی دلچسپی کے لئے وافر مواد اس میں موجود ہے۔

● ۱۹۴۰ء کی مارچ میں آل انڈیا مسلم لیگ نے لاہور رزولیشن منظور کی اس کی مجلس عمل کی میٹنگ میں محمد علی جناح۔ لیاقت علی۔ راجہ غزنفر علی خاں۔ سردار عبدالرب نشتر۔ خضر حیات خاں وغیرہ

خواجہ ناظم الدین کی وزارت اور آئین ساز اسمبلی کا تختہ الٹانے کا سہرا اے کے بروہی کے سر بندھتا ہے۔ تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے۔ خواجہ ناظم الدین کو بروہی نے گورنر جنرل غلام محمد کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ جب وہ اشتعال میں نہ آئے تو پھر غلام محمد کو وزیر اعظم کے خلاف اکسانا شروع کیا

اس نے کہا کہ وزیر اعظم آپ کو معزول کرانا چاہتے ہیں اس سلسلے میں انھوں نے مجھ سے مشورہ کیا اور مجبوراً مجھے مشورہ دینا پڑا۔ مگر یہ مشورہ دینے کے باوجود یہ بات آپ کو اس لئے بتانا ضروری سمجھا کہ آپ قابل رشک بصیرت کے مالک ہیں۔ پاکستان کو آپ کے مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ خواجہ

ناظم الدین جیسے کمزور آدمی ہرگز ہرگز پاکستان کو سنبھال سکتے۔ غلام محمد نے جو یہ مشورہ س اس کی رگِ آمریت پھڑک اٹھی۔ اس نے خ ناظم الدین کو فوراً دربار میں پیش ہونے کا حکم د خواجہ اس وقت کراچی سے حیدر آباد جانے کے ریلوے اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ وزیر اعظم

ن سے گورنر ہاؤس آنا پڑا وہ گورنر کے تیور
حیران ہو گئے۔
غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو سازشی اور
لیا کیا کہا اور پھر ان سے استعفیٰ طلب کر لیا۔
صاحب نے غلام محمد کے الزامات کی تردید کی
بروہی کا تذکرہ بھی کیا انھوں نے استعفیٰ دینے
انکار کر دیا۔ غلام محمد نے ان کی اسمبلی توڑ دی۔
روز جب نئی کابینہ بنی تو اے کے بروہی اس
وزیر قانون تھے۔ اس دن سے مرتے دم تک
ہی نوکر شاہی کے گرگے بنے رہے۔ ریاست کے
اہم ستون کی حیثیت سے عدلیہ کا کردار نوکر شاہی
کردار سے کچھ زیادہ گھناؤنا اس لئے ہے کہ
لیہ آقدس کے پردے میں شکار کرتی ہے۔
آیئے اب آگے چلیں۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء
تصویر سامنے ہے۔ داخلی پس منظر میں ہم ۹ سیاسی
عتوں کو پیپلز پارٹی کے خلاف دیکھتے ہیں۔ یہ
ہی ہیں جو فاطمہ جناح کے مقابلے میں ایوب خاں کے
اتھ تھیں۔ پھر ضیاء الحق کی حلیف اور مشیر بنیں۔
بھٹو کے خلاف تحریک کا محور انتخابات میں دھاندلیوں
شور تھا جس کی ضیاء الحق نے پہلی پریس کانفرنس
میں توثیق کی۔ اور ۹۰ دن کے اندر انتخابات کرانے
وعدہ کیا۔ نظام مصطفیٰ کا شوشہ تو بعد کا تھا۔
بیرونی افق پر ہم پاکستان، بھارت اور
سری لنکا کو ایک ہی زنجیر میں پرویا ہوا دیکھتے ہیں۔
عجیب بات ہے ان تینوں ملکوں میں حکمران جماعتوں
کو ایک ہی طریقے سے ٹھکانے لگانے کی کوشش کی
گئی۔ بھارت اور سری لنکا میں چونکہ نوکر شاہی
پاکستان نوکر شاہی کی طرح ذہین نہ تھی اس لئے
وہاں اقتدار کی منتقلی ایک عام طریقے سے ہو گئی
پاکستان میں صورت حال مختلف یوں ہوئی کہ بھٹو
نے تقریباً ڈیڑھ سال کی گنجائش کے باوجود قبل از
وقت انتخابات کروا دیئے اور اس کی بدبختی یہ
ہوئی کہ وہ انتخاب میں جیت بھی گیا ساری گڑبڑ اندازوں
اور تخمینوں میں حیران کن غلطی کی وجہ سے ہوئی ——
چنانچہ ضروری ہو گیا تھا کہ نوکر شاہی خود بے نقاب
ہو کر سامنے آئے اور اس گٹھ جوڑ کو جسے چھپانے کی

بہت کوشش کی گئی تھی بے نقاب کر دے عام
فوجی جرنیلوں کی روایتی سلوک کے برعکس جنرل ضیاء الحق
اور اس کے دوستوں کا پیپلز پارٹی کے خلاف جنگی
جارحیت کی انتہا تک جانا نوکر شاہی کی پاکستان
کے عوام کے خلاف آخری جنگ کی سی اہمیت
اختیار کر چکا تھا۔ اس کا ایک اور ثبوت کہ ۹ سیاسی
جماعتیں انتخابات کے اعلان سے بہت پہلے ہی
فوج کے ساتھ گٹھ جوڑ کر چکی تھیں یہ ہے کہ جنرل
ضیاء الحق نے اپنے دوستوں کے حق میں انتخابی کامیابی
کے امکانات معدوم دیکھ کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے
انتخابات کو خیرباد کر دیا خارجی ضرورتوں اور دباؤ
کے تحت وہ انتخابات کرانے پر مجبور اور پابند
تھا۔ مگر اس کی حتی المقدور کوشش یہی تھی کہ پیپلز پارٹی
کسی بھی قیمت پر منتخب نہ ہو سکے۔ سینکڑوں بااثر
افراد کو احتساب کے ذریعے سات سالوں کے لئے
نااہل قرار دے کر بھی وہ مطمئن نہ ہوا۔ تو اس نے
۱۹۷۳ء کے آئین کا انتخابی طریقہ کار ہی بدل ڈالا۔
اس نے ایک ایسا طریقہ وضع کیا جس سے
اس کے خاص الخاص آدمی انتخابات میں براہ راست
مقابلہ میں ضمانت ضبط کروانے کے باوجود اسمبلیوں
آ سکیں۔ سیاسی جماعتوں کا رجسٹریشن اور رجسٹریشن
سے پہلے آوٹ کی پابندی اس لئے لگائی کہ پیپلز
پارٹی کو انتخابات سے باہر رکھ سکے بھٹو کو پھانسی
کی سزا سنانے والے لاہور ہائی کورٹ کے چیف
جسٹس مولوی مشتاق کی سربراہی میں قائم الیکشن
کمیشن میں بیگم بھٹو کو پارٹی کی رجسٹریشن کے لئے خود
پیش ہونے کی شرط لگانا، ایک ہی کھیل کا حصہ
تھا پیپلز پارٹی نے رجسٹریشن کا بائیکاٹ کیا تو
مفتی محمود نے فریاد کی کہ پیپلز پارٹی آزاد امیدوار
کھڑے کر کے اسمبلی میں آ جائے گی چنانچہ
ضیاء الحق نے یہ راستہ بند کرنے کے لئے تمام
امیدواروں کے حاصل کردہ ووٹوں کی مجموعی
تعداد کا ۱۵ فی صد حاصل کرنا ہو گا جب یہ چیلنج
بھی قبول کر لیا گیا تو اسلام کے سپاہی جرنیل ضیاء الحق
کو ہتھیار پھینک دینے پڑے اور سب کچھ درہم
برہم کر کے رکھ دیا۔
بھٹو کے زوال کا بنیادی سبب تلاش

کرنے میں بہت سے ذہین افراد نے فاش
غلطیاں سرزد ہوتی رہی ہیں۔ کچھ لوگوں نے
اس کے دور کی مہنگائی کا سبب قرار دیا کسی
نے اسلام سے روگردانی کو جواز بنایا کسی نے سرحد
اور بلوچستان کو اس کی پالیسیوں کو، کسی نے آئین
میں ترامیم کو اور کسی نے اپوزیشن کے بارے میں
اس کے رویے کو۔ کچھ ایسے بھی دانشور ہیں۔
جنہوں نے مذکورہ تمام خرابیوں کو اس کے زوال
کا جواز قرار دیا۔ بھٹو ان تمام الزامات کا جواب
دینے کے لئے زندہ نہیں ہے مگر وہ تمام لوگ
اب بھی زندہ و سلامت ہیں جو مذکورہ خرابیوں کے
حوالے سے اس ملک کے عوام کے طرفدار کہلاتے
تھے ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ ۵ جولائی ۷۷ء
کو ضیاء الحق نے کیا جواز پیش کیا تھا مارشل لاء
اور پھر سپریم کورٹ میں اے۔ کے بروہی نے نظریہ
ضرورت کے حوالے سے مارشل لا کے اثبات
میں کیا ارشاد کیا تھا ہم بھٹو کے زوال کے اسباب
بھٹو کی تلافی کے حوالے سے تلاش کرنا ضروری
سمجھتے ہیں۔ بھٹو کے زوال نے جس عروج کو جنم
دیا ہے ہم اسے دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں منطقی
طریقہ یہ نہیں کہ ہم تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھیں
سیاق و سباق کے بغیر کوئی مفہوم مرتب کریں۔
منطقی طریقہ یہی ہے کہ تصویر کے دونوں اطراف
کو سیاق و سباق کے تعلق سے دیکھیں۔ اگر ہم
مذکورہ خرابیوں کو بھٹو کے زوال کا سبب قرار
دینے پر اصرار کریں گے تو ہمیں پھر بھٹو کے تلف
ہو جانے کے بعد ثبوت فراہم کرنے ہوں گے۔
کہ مہنگائی میں تخفیف ہو گئی ہے اسلام بحال ہو گیا
ہے سرحد اور بلوچستان کے بارے میں پالیسیاں
تبدیل ہو گئی ہیں۔ آئین اپنی اصلی حالت
میں نافذ ہو چکا ہے۔ اور اب اس ملک
میں حکمران طبقے نے اپوزیشن کے بارے میں انتہائی
دوستانہ اور مخلصانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔
بدقسمتی سے ہم یہ سب کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔
حقائق کی منطق یہ بتاتی ہے کہ حالات بدترین سے
کچھ آگے ہی ہیں جن لوگوں نے بھٹو کے دور میں
(باقی آئندہ)

سفر نامہ جاپان
(تیسری قسط)

مجتبیٰ حسین

جاپان چلو۔ جاپان چلو

ہم نے پچھلی قسط میں آپ کو ہانگ کانگ کی آمد کے بارے میں حسب استطاعت خبردار کیا تھا۔ ہانگ کانگ ملک کیا ہے بس ایک جزیرہ سا ہے اسے سمٹا ہوا دل عاشق کہہ لیجیے۔ جب ہمارا طیارہ نیچے اُترنے لگا تو پورا جزیرہ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ فلک بوس عمارتوں کو اپنی ہتھیلی میں سجائے ہوئے سمندر کی لہروں سے کھیلتا ہوا یہ جزیرہ اتنا خوبصورت لگا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ یہاں برسوں انگریزوں کی حکمرانی رہی ہے۔ اب بھی ایک اعتبار سے ہے یہاں سے چین کی سرحد بھی دکھائی دیتی ہے۔ باشندے زیادہ تر چینی ہیں۔ چینی زبان بولتے ہیں اور انگریزی زبان پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ بڑا کاروباری مرکز ہے۔ ہانگ کانگ کی رونق وہاں کے باشندوں سے نہیں بلکہ ان سیاحوں سے ہے جو آتے ہوئے اپنی جیبوں میں دولت اور دلوں میں ارمان بھر کر لے آتے ہیں۔ چونکہ ہانگ کانگ کی بندرگاہ فری پورٹ ہے اس لئے ہر کوئی منہ اُٹھائے چلا آتا ہے۔ یہاں ہر چیز بکتی ہے۔ ہمارے ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دو سال پہلے ہانگ کانگ کے ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں سامان خریدنے گئے۔ چیزیں اُلٹ پلٹ کر دیکھیں۔ کوئی شے پسند نہ آئی۔ اچانک سیلز گرل پر نظر جو پڑی تو وہ پسند آ گئی۔ لہٰذا سیلز گرل کو خرید کر لے آئے۔ ہانگ کانگ سے کوئی شخص خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔ کاش سکندر کو ہانگ کانگ جانے کا موقع ملتا۔ ہمارا طیارہ یہاں دو گھنٹے ٹھہرنے والا تھا ہمیں سہولت دی گئی تھی کہ ہم چاہیں تو طیارہ گاہ کے ڈیوٹی فری بازار سے چیزیں خرید لیں۔ دو گھنٹے گذارنے کا معاملہ تھا۔ سو ہم اپنے جاپانی دوست آئی یو کے ساتھ ڈیوٹی فری بازار میں کھو گئے۔ دنیا جہان کی چیزیں بکی ہوئی تھیں۔ ہم نے زندگی میں کبھی اس طرح شاپنگ نہیں کی جس طرح کی جاتی ہے۔ بہت شاپنگ کی تو سگریٹ خرید لیے یا پان خرید لیے۔ اس کے علاوہ شاپنگ کے میدان میں ہمارا کوئی عملی تجربہ نہیں ہے۔ لہٰذا دوکانوں کے سامنے یوں کھڑے رہے جیسے بین کے سامنے بھینس کھڑی ہوتی ہے۔ تاہم سگریٹوں کی شاپنگ کے معاملہ میں اپنے دیرینہ تجربہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم نے اتنے سارے سگریٹ خرید لئے کہ جب ہم طیارے میں واپس ہوئے تو ہمارے دونوں کندھوں اور دونوں ہاتھوں میں سگریٹوں سے بھری ہوئی تھیلیاں لٹک رہی تھیں۔ ہانگ کانگ کے ہوائی اڈے کے بارے میں ایک بات اور عرض کر دیں کہ یہ بالکل سمندر سے متصل ہے۔ لہٰذا جب طیارہ ہوائی اڈے پر اترنے لگتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے طیارہ ہوائی اڈے پر نہیں اتر رہا بلکہ سمندر میں گر رہا ہے۔ ہمیں بھی اس منظر سے بڑی پریشانی ہوئی تھی۔ آپ کبھی ہانگ کانگ جائیں تو ہوائی اڈے کی اس ہیئت ترکیبی سے بالکل پریشان نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو آپ زمین پر ہی اتریں گے۔

ڈھائی گھنٹوں کے بعد جب ہمارا طیارہ ٹوکیو کی طرف روانہ ہوا تو کچھ نہ پوچھیے کہ طیارے میں کیا حالت تھی۔ بس تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اب زیادہ تر مسافر جاپانی تھے اور آپ جانتے ہیں کہ پین امریکن ہوائی سروس کو جاپان پر بڑا ترس آتا ہے۔ ترس کیوں نہ آئے جاپانی آخر کو ترقی یافتہ ملک کے باشندے جو ٹھہرے لہٰذا طیارے کے عملے نے ہانگ کانگ کے بعد آداب مہمان نوازی یکسر بدل دیئے۔ وہ بینکاک والی بات نہیں تھی۔ بینکاک کے تلخ تجربے کے پس منظر میں ہم نے لنچ کے وقت ڈرتے ڈرتے ایر ہوسٹس کو پہلے سے یاد کیا اور دست بستہ گذارش کی کہ ہمیں سور کے گوشت سے محفوظ رکھا جائے۔ اس نے پوچھا "آپ کیا کھانا چاہتے ہیں" ہم نے کہا مرغ، مچھلی، بیف، سبزی جو کچھ بھی آپ کے بس میں ہو وہ دے دیجیے۔ ہم آپ کے حق میں دُعا کریں گے۔" تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو دیکھا کہ وہ اپنے لبوں کی آخری حدوں تک ایک لمبی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اور ہاتھ میں ایک بڑی سی کشتی پکڑے چلی آ رہی۔ کشتی پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس میں مرغ بھی ہے مچھلی بھی ہے، بیف بھی اور سبزی بھی۔ ہم نے کہا کہ اتنی ساری چیزوں کا ہم کیا کریں گے۔ اپنی مسکراہٹ میں ایک نئی طرحداری پیدا کرتے ہوئے معصومیت سے بولی "آپ کھائیں اور کیا۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" ہمارے جاپانی دوست نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "محترمہ آپ سے پہلے جو ایر ہوسٹس یہاں تھی انھوں نے تو انھیں صبح سے بھوکا ہی رکھا تھا۔ اب آپ کا یہ لطف و کرم کیا معنی رکھتا ہے۔" ہم نے اپنے جاپانی دوست سے کہا "بھیا کیوں بے چاری کا دل دکھاتے ہو، ہم جہاں بھی گھنی چھاؤں دیکھتے ہیں وہیں بیٹھ جاتے ہیں چھاؤں نہ ملے تو سورج سے بھی آنکھیں ملا لیتے ہیں ان کا کرم ہے کہ انھوں نے ہمیں اس قابل سمجھا، درگذر کیا اور ہماری بساط کیا۔

ہانگ کانگ سے ٹوکیو تک ساڑھے تین گھنٹے کا سفر کس طرح کٹا ہمیں کچھ یاد نہیں۔ ہانگ کانگ کے بعد طیارے میں جاپانی زبان میں بھی اعلان ہونے لگے۔ یعنی جاپانی زبان میں ہمیں یہ بتایا گیا کہ ایمرجنسی کی صورت میں ہمیں طیارے کے کرن سے دروازے سے باہر کودنا چاہئے۔ آکسیجن کی کمی کی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ہم نے جاپانی زبان پہلے پہل یہیں سنی۔ کانوں کو عجیب و غریب لگی۔ جب ہم ٹوکیو کے بین الاقوامی ہوائی اڈے نریتا کے قریب پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ مقامی وقت کے مطابق ساڑھے چار بجے ہوں گے۔ طیارے نے پھر ایک چکر ہوائی اڈے کا لگایا۔ اور اسی بیچ ہمارے جاپانی دوست نے ایک مرحلے پر ایک پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہ دیکھو جاپان کا شہرہ آفاق پہاڑ فیوجی نظر آ رہا ہے۔ ہم نے دیکھا بڑا بردبار اور سنجیدہ پہاڑ ہے۔ سر پر برف کی سفید ٹوپی پہنے چپ چاپ کھڑا گیان دھیان میں مصروف

ہم نے جدھر نظر دوڑائی ادھر چھوٹے چھوٹے
اور ان پہاڑوں کے دامنوں میں چھوٹے
جاپانی گھر نظر آئے۔ ہماری آنکھوں نے
جاپان کو اسی طرح دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ٹوکیو کے بین الاقوامی
ڑ تیار پر تھے۔ ہم نے سوچا طیارے پر سیڑھی
ئے تو ہم بھی نیچے اتریں گے۔ مگر پتہ چلا کر یہاں
ل کو سیڑھی لگانے کا رواج نہیں ہے۔ طیارہ
ب ایسے گلیارے سے جا لگتا ہے جہاں سے آپ
ر چلنے والے راستے پر کھڑے ہو کر کہیں بھی
ہیں۔ یہاں آپ کو قلی کوئی نہیں ملے گا۔ اپنا
آپ اٹھائیے اور خودکار راستے پر اسے
ھڑے ہو جائیے راستہ بھی چلے گا آپ بھی
کے اور سامان بھی چلے گا۔ ہم جہاں جاتے ہیں
اعری ہمارے ساتھ چلی آتی ہے۔ خودکار
ے پر چلتے ہوئے ہمیں شاہد صدیقی مرحوم کا
ر یاد آگیا ؎

ب پل کے رُکنے سے دور ہو گئی منزل
رف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں

ہمیں حیرت ہوئی کہ اُردو زبان پر اتنی
ت رکھنے کے باوجود جاپانیوں نے شاہد
مرحوم کے اس شعر کو ہم سے پہلے سمجھ لیا تھا۔
یر تک راستہ چلتا رہا اور ہم ساری حیات
ی ساری کائنات کو جو دو بیگز پر مشتمل تھی،
لے کر چلنے کے وہم میں مبتلا رہے۔ ٹوکیو کے
ین الاقوامی ہوائی اڈے کا شمار دنیا کے سب
ے اور مصروف ہوائی اڈوں میں ہوتا ہے۔ مئی
ء میں اس ہوائی اڈے نے کام کرنا شروع کیا۔
ٹوکیو کے جنوب مشرق میں ستّر کلومیٹر دور واقع
ں دن بھر میں کوئی دو سو طیارے دنیا بھر کے
ے آتے ہیں۔ بڑی چہل پہل اور رونق لگی
ہے۔ جاپان کی چکا چوند کر دینے والی روشنیوں
ری شناسائی یہیں ہوئی ہمیں کسٹم کی رسومات
کرنا تھیں اور ہم سخت پریشان تھے۔ اس
یں کہ ہم اپنے ساتھ افیون یا چرس لے آئے تھے
ں لئے کہ ہمارے بیگ میں جو سامان تھا وہ اس
ہیں تھا کہ کوئی جاپانی اسے دیکھ سکے۔ تین معمولی

سے سوٹ تھے، چار پھٹے پرانے شرٹس اور تین بنیانیں تھیں جن میں ایک پھٹی ہوئی بنیان بھی شامل تھی۔ اور پھر طباعت اور اشاعت کے موضوع پر کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ کسٹم کے جاپانی کلرک نے جو انگریزی جانتا تھا، ہم سے پوچھا "آپ کو کچھ ڈکلیئر کرنا ہے" ہم نے کہا "غریب آدمی ہیں اپنی شرافت کے سوا اور کیا ڈکلیئر Declare کر سکتے ہیں۔ وہ بولا "آپ کے بڑے بیگ میں تو کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے البتہ آپ کے ہینڈ بیگ میں ضرور کوئی قابل اعتراض چیز نظر آتی ہے۔ (موصوف نے کسی الیکٹرنک آلے سے اس قابل اعتراض چیز کا پتا چلا لیا تھا) ہم نے معاملے کی نزاکت کو تاڑ کر کہا "بالکل بجا فرمایا آپ نے ہمارے ہینڈ بیگ میں ہمارے مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے ہیں جنھیں ہم نے یوں ہی بس اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ چاہیں تو آپ انھیں ضبط کر لیں۔ یوں بھی جاپان میں اردو کتابوں کا کیا کام؟" وہ بولا "آپ کی کتابوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے کچھ چیزیں ہیں جو سیاہ رنگ کی ہیں۔ تب ہمیں خیال آیا کہ موصوف کا اشارہ بیدری صنعت کے سامان کی طرف ہے۔ ہم جاتے ہوئے اپنے ساتھ بیدری صنعت کی کئی چیزیں جیسے جست میں بنے ہوئے ایشٹرے، بٹن، ٹائی پن اور ڈبیاں لے گئے تھے۔ اپنے جاپانی دوستوں کو تحفے کے طور پر پیش کرنے کے لئے۔ ہم نے فوراً اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور بیدری صنعت کا سامان نکال نکال کر اس کی خدمت میں پیش کرنے لگے۔ وہ حیرت سے انھیں دیکھتا رہا، پھر بولا "بہت خوبصورت چیزیں ہیں، آپ ہندوستانی اتنی خوبصورت چیزیں کیسے بنا لیتے ہیں۔ اور پھر مجھے حیرت یہ ہے کہ آپ نے اس دھات کو سیاہ رنگ کا کیسے بنا دیا ہے۔" ہم نے اپنا سینہ پھُلا کر کہا "ایسی چیزیں بنانا تو ہم ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ دھات سیاہ رنگ کی کیسے بن گئی تو بھیا یہ ہمارا ٹریڈ سیکریٹ ہے اگر آپ کو بتا دیں تو ہماری کیا انفرادیت رہ جائے گی۔"

ہم نے بیدری سامان میں اس کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر ایک ایشٹرے اس کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ بہت سمجھایا کہ یہ تحفہ ہے اور ہمارے یہاں کسٹم افسروں کو تحفے پیش کرنے کا رواج عام ہی نہیں، بلکہ لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے آپ بھی لیجئے۔ وہ بولا "نہیں، جیسی آپ کی انفرادیت ہے ویسی ہی انفرادیت ہماری بھی ہے۔"

خیر ہم وہاں سے سامان اُٹھا کر بھاگے جہاں جاتے دروازے خود بخود کھُل جاتے۔ جاپان کی آٹومیٹک زندگی سے یہ ہمارا پہلا واسطہ تھا اگرچہ ہم ٹوکیو پہنچ چکے تھے۔ مگر پھر بھی ہنوز دلّی دور است والا معاملہ درپیش تھا۔ کیونکہ ابھی ٹوکیو ہم سے ستّر کلومیٹر دور تھا۔ ایشیائی ثقافتی مرکز نے ہمیں لیموزین بس کی ٹکٹ پہلے سے بھیج دی تھی۔ اور ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم اس میں بیٹھ کر ٹوکیو کے سٹی ایئر ٹرمینل پہنچ جائیں اور پھر اس کی دوسری منزل کے انکوائری کاؤنٹر پر آجائیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی ہماری راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا ہوگا۔ ہم نے لیموزین بس میں سامان رکھا اور بیٹھ گئے۔ جاپانی اپنی بسیں بھی طیاروں کی طرح چلاتے ہیں۔ باضابطہ اعلان ہوا کہ ستّر کلومیٹر کا یہ فاصلہ ہم ایک گھنٹے میں طے کریں گے۔ باہر کے موسم کے بارے میں بتایا گیا۔ ایمرجنسی کی صورت میں بس سے باہر کودنے کے طریقوں سے آگاہ کیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بسوں کے دروازے خود بخود کھلتے اور بند ہو جاتے۔ موسیقی الگ بجتی رہتی، ڈرائیور اگرچہ موجود تھا۔ مگر اس کا کام بٹن دبانا زیادہ اور بس چلانا کم تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور جاپانیوں کو اندھیرے سے سخت نفرت ہے۔ لہٰذا اپنی سڑکوں اور مکانوں کو اتنا روشن رکھتے ہیں۔ کہ آدمی کو اپنی روشنیٔ طبع کا استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ ہمیں جاپان آئے ہوئے دس دن ہو چکے ہیں۔ اور ہمیں آج تک اپنی روشنیٔ طبع کا استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ غرض روشنیوں میں جگمگاتے اور روشنیوں میں نہاتے ہوئے ہم ٹوکیو کے ہاکوزاکی ایئر ٹرمینل اسٹیشن پر پہنچے۔ جاپان کی گھڑیوں میں شام کے سات بج رہے تھے۔ اور ہماری گھڑی ہندوستان میں دن کے ساڑھے

(باقی ص ۴۹ پر)

تازہ بہ تازہ نو بہ نو

آپ بھی اِس کالم کے لیے خبریں بھیج سکتے ہیں، اور تصاویر بھی۔

چنگاری کے گزشتہ شمارے کی اشاعت کے بعد دہلی میں کئی اہم ثقافتی تقریبات ہوئیں۔ ایوانِ غالب میں تقسیم انعامات اور غالب کے بارے میں تقریر کرنے والوں میں پاکستان کے کئی ممتاز اسکالروں کے علاوہ ہندوستانی علما نے بھی حصہ لیا۔ اس تقریب کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اس میں بعض ایسے اہم اسکالروں کے نام نہیں تھے جو غالب کی شخصیت اور فن پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کا زندگی فن اور زمانہ کے بارے میں ایک خاص اندازِ فکر ہے

مقررین میں رشید حسن خاں کی تقریر انتہائی بے محل اور ناگوار معلوم ہوئی۔ اردو املا پر انھوں نے ایک ضخیم کتاب مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں ان کا عطیہ صرف یہ ہے کہ عبدالستار اور دوسرے علماء کی کاوشوں کو جمع کر دیا ہے۔ اردو املا ان کے ذہن پر اس قدر مسلط ہے کہ موقع ہو یا نہ ہو اس کے بارے میں تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ اور آپ جانئے املا اور رسم الخط کے موضوع پر ہر اردو والا ہندی والا اظہار خیال کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ اس اہم موقع پر بھی انھوں نے غالب کے املا سے بحث شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مضحکہ خیز صورتِ حال سامنے آگئی۔ ہر آدمی اسٹیج پر آکر اظہار خیال کرنے لگا۔ ایک کہتا طوطا طوئے سے لکھنا چاہئے " دوسرا کہتا نہیں صاحب ت سے لکھنا چاہئے۔ اس تقریب میں ایک اور کمی یہ تھی کہ ایوان غالب کے بانی مرحوم صدر جمہوریہ فخرالدین علی کی بیگم کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ ایوان غالب اور غالب صدی جشن کی کامیابی میں بیگم عابدہ احمد کا زبردست کنٹری بیوشن رہا ہے۔

● ساہتیہ اکاڈمی نے ۱۹ زبانوں کے مصنفوں کو انعامات دیئے۔ یہ انعامات ۷۷ سے ۷۹ تک کی کتابوں پر دیئے گئے تھے اس بار کشمیری، منی پوری اور تلگو کو انعام نہیں ملا۔ اردو میں اسلوب احمد انصاری کو "اقبال کی تیرہ نظمیں" پر انعام دیا گیا اور ہندی میں کرشن سوبتی کو "زندگی نامہ زندہ رُخ" پر انعام ملا۔ آسامی میں یوگیش داس۔ بنگلہ میں کرلیش لیسو، ڈوگری میں کنور وجگی۔ انگریزی میں سرنیواس آئنگر، گجراتی میں جینت پاٹھک، کنڑ میں راما سوامی آئنگر، کوکنی میں منوہر سرڈیسائی، میتھلی میں سُدھا نسو، ملیالم میں پنیل کچ عبداللہ، مراٹھی میں منگیش پنڈر گاؤنکر، نیپالی میں اوکیٹا باما، اڑیا میں انت پٹنائک، پنجابی میں سکھ پال ویر سنگھ حسرت، راجستھانی میں رامیشور، سنسکرت میں پی پی دے وس، سندھی میں کرشن کھٹوانی، تمل میں کرشن داسن کو انعام دیا گیا۔

● جوش ملیح آبادی کو حکومت ہند نے تاحیات وظیفہ دینے کا فیصلہ دیا ہے۔

● کویت اخبار روزنامہ عرب ٹائمز دو صفحے اردو میں بھی شائع کرتا ہے۔

● بنگال کے چیف منسٹر بسو نے یقین دلایا ہے کہ بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے گا۔

● باجپئی اردو کو یوپی میں دوسرا درجہ دینے کے خلاف ہیں۔

● وزارت تعلیمات نے بانی کو پانچ ہزار روپے کی مدد دی ہے۔

● صادق دہلوی کی خوبصورت کتاب تین زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔ انوکھی کتاب تصویروں سے بھی مزین ہے۔

● مظہر ہوشیارپوری کا مجموعہ کلام بوند بوند آگ شائع ہو گیا ہے۔

● ایک اور اہم تقریب میں حاجی انیس دہلوی ایڈیٹر فلمی ستارے نے ساحر نمبر کا اجرا کیا۔ تقریب اس لئے بھی یادگار بن گئی کہ اس میں ملک کی چیدہ علما نے حصہ لیا۔ ظ انصاری کی تق خاص طور پر پسند کی گئی۔

● ترقی پسند مصنفین نے بھی غالب اکاڈ میں ساحر لدھیانوی کو خراج عقیدت پیش اس میں اندر کمال گجرال کی تقریر سب سے زیا "حقیقی" اور بامعنی تھی۔ پرکاش پنڈت مضمون بھیشم ساہنی نے سُنایا، محفل میں معیا کیلاش ماہر، کمیز احمد شیخ، اجمل اجملی، قمر رئ غلام ربانی تاباں اور کملیشور وغیرہ کئی اہم فن موجود تھے۔

● جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں لندن تشریف لانے والے شاعر اکبر حیدری کے مجمو کلام کا اجرا ہوا اس موقع پر وحید اختر اکبر حیدری کی شخصیت اور فن پر ایک خوبصو مضمون پیش کیا۔

● خان کو حیدر آباد میں خراجِ عقیدت پیش گیا۔ اور بدایوں میں ان کے مزار درگاہ یوسف پر چادرِ گل چڑھائی گئی۔

● بھوپال میں عبدالمتین نیاز کا دوسرا شو مجموعہ "حرف و صد" کی رسم اجرا شہریار کے ہا عمل میں آئی۔

● شیخ عبداللہ نے اردو اور ہندی کو آ بنانے کا مشورہ دیا۔

● سیاست کے ایڈیٹر عابد علی خاں کو پدم کا اعزاز دیا گیا۔

● حیدر آباد میں پروفیسر مسعود حسین خاں پروفیسر آل احمد سرور کی ادبی خدمات پر مشت کتاب کی رونمائی کی۔

● ۱۵ ویں صدی ہجری تقریبات کے سلسلے میں بھون میں ایک شاندار تقریب ہوئی جس میں عالموں نے مقالے پیش کئے۔ ان میں سے چند جلد ہی چنگاری میں پیش کئے جائیں۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اسلام اور ہندستان کے موضو پر ایک پرمغز تقریر پیش کی۔ انھوں نے بجا طور حقیقت پر زور دیا کہ اسلامی تہذیب بھی ہندس

بقیہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو

گذشتہ ۲۹/۳۰ نومبر ۱۹۸۰ء کو، بہار کے صحت بخش شہر رانچی میں ترقی پسند نظریات سے دلچسپی رکھنے والے ادیبوں کا ایک کنونشن منعقد ہوا۔ یہ کنونشن رانچی کے نوجوان ادیبوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ یہ دو روزہ پروگرام کئی نشستوں پر مشتمل تھا۔ سمینار میں پڑھے گئے مقالات نے ادب کے وناگوں گوشوں کو اجاگر کیا۔ بالخصوص ترقی پسند ادب کیا ہے، ’حسرت موہانی کی شخصیت اور فن‘ اور ’آٹھویں دہائی میں اردو افسانہ‘ کے عنوانات سے پیش کئے گئے۔ مضامین نے بے حد گرما گرمی پیدا کی اور کئی اہم اور مفید نتائج برآمد ہوئے۔ شرکائے اجلاس میں اویس احمد دوراں سید احمد شمیم، فخر الدین وامل، الیاس احمد گدی، پرکاش فکری، صدیق مجیبی، کھگندر ٹھاکر، دینیشور پرشاد، وہاب اشرفی، ش۔ اختر۔ اور منظر شہاب کے علاوہ بیرونِ صوبہ سے قمر رئیس، جوگندر پال، اور صادق کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

کنونشن کا آخری جلسہ انجمن کی تنظیم سے متعلق تھا۔ جس میں بہار ریاستی انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل نو کا فیصلہ کیا گیا۔ اور مندرجہ ذیل عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

مجلس الصدور:

منظر شہاب ۔ چیرمین

شکیلہ اختر

اویس احمد دوراں

ش ۔ اختر

الیاس احمد فکری

شاہد احمد شعیب

صدیق مجیبی

معتمد: عبد القیوم ابدالی

منسلک معتمدین: لطف الرحمٰن ۔ منظر کاظمی ۔ سید احمد شمیم ۔ افصح ظفر ۔ منظر سنہسارول ۔ احمد عزیز ۔ یوسف خاں آتش ۔ ضیاء الرحمٰن ۔ حسن جعفری، شعیب راہی ۔ شان بھارتی ۔ سید منظر امام ۔ ساغر برنی ۔

خازن: احمد حبیب ۔

جھوٹ ۔ بولنے والے کی گردن پر

سنا ہے کہ ولی گجراتی کے ایک ہم وطن سرمایہ دار مگر اچھے شاعر نے دہلی کے تین شاعروں کو مدعو کیا ان سے کہا گیا کہ مشاعرے میں تشریف لائیں فی شاعر ایک ہزار دیا جائے گا۔ یہ تینوں شاعر دہلی سے تشریف لے گئے دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ ”مزے آئیں گے“ مگر ہوا یہ کہ جب یہ حضرات وہاں پہنچے تو انہیں ایک مہنگے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا لیکن دھمکی دی گئی کہ اگر تم لوگوں نے ہوٹل سے کھانا کھایا تو پھر مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ ہوٹل کے بیرے کو بھی تاکید کر دی گئی کہ خبردار ان لوگوں کو ہرگز ہرگز کھانا نہ دیا جائے۔ تو صاحب یہ شعراء کرام ایک روز بھوکے رہے دوسرے دن میزبان شاعر صاحب تشریف لائے مہمانوں کو کھانا کھلوایا پھر سگریٹ کی ڈبیہ نکالی اور دوستوں کی طرف بڑھایا جیسے ہی ایک نے سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا یہ چیخے ۔ ”بے شرم کتوں“ مفت خوری کی عادت کیوں نہیں چھوڑتے سگریٹ پینا ہے تو خود خریدو میرے سگریٹ کو ہاتھ مت لگاؤ۔ اتفاق سے میزبان شاعر کے ایک مقامی دوست بھی ان کے ساتھ تھے انھوں نے اپنی ڈبیا بڑھائی مگر مقامی سرمایہ دار شاعر نے ڈانٹ دیا بچارے اپنا سا منھ لے کر رہ گئے پھر شراب کی بوتل کھلی پانچ گلاس منگوائے گئے شراب ڈھلی مگر تین گلاس خالی رہے بچارے مہمان جو سمجھ رہے تھے کہ اب میزبان کا غصہ کم ہوا ہے اور وہ مہربان ہو رہا ہے۔ ایک بار پھر تلملا کر رہ گئے۔ انہیں شاید یہ خیال نہیں تھا کہ ان کے ساتھ جو بے بلی کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ خیر صاحب مشاعرہ ہوا مگر سرمایہ دار شاعر نے ہزار روپے دینے سے انکار کر دیا۔ مدعو شعراء کرام سے کہا گیا کہ تم نے مختلف عیاشیوں پر اتنی رقم خرچ کی کھانے پر اتنی رقم خرچ ہوئی قیام پر اتنی رقم خرچ ہوئی ۔ بس اب کرایہ لو اور چلتے بنو۔ تو صاحب یہ شعراء کرام دہلی واپس آ گئے۔ مگر اس ستم ظریف سرمایہ دار شاعر نے ان شعراء کرام میں سے کسی ایک مشہور شاعر کے نام خط لکھا اور اس میں ان کی عیاشیوں اور بد معاشیوں کا بھی حوالہ دیا یہ خط غالباً دانستہ طور پر گھر کے پتہ پر پوسٹ کیا گیا شاعر کی بیوی نے خط وصول کیا، لفافہ چاک کیا اور اس کے بعد اس بے چارے پاکباز شاعر کی شامت آ گئی ۔۔۔

بلجیت سنگھ مطیر

محمد عثمان عارف نقشبندی

شخصیت اور فن

محمد عثمان عارف نقشبندی نائب مرکزی وزیر ہاؤسنگ ان کے نعتیہ کلام کے مجموعہ کی حال ہی میں وزیر اعظم نے رونمائی کی۔

عظیم یونانی مفکر افلاطون نے انسانی فلاح اور ریاستی خوشحالی کی ممکنہ تشکیلی امکانات کے حصول کے لئے اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے تجویز کیا تھا کہ "فلاسفروں کو بادشاہ ہونا چاہیئے"۔ بنی نوع انسان کی بدقسمتی ہے کہ اگرچہ دنیا کی تاریخ نے کئی کروٹیں بدلیں اور سینکڑوں فلاسفر اور لاتعداد بادشاہ پیدا کئے لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ یہاں ان دونوں کو ایک ہی قالب میسّر ہوا ہو۔ دُنیا کی تواریخ میں شاذ ہی کوئی ایسا فلاسفر مل سکے کہ جو بادشاہ بنا ہو اگرچہ اشوکِ اعظم اور اکبرِ اعظم ایسے بادشاہ ضرور ہوئے ہیں جنھوں نے فلاسفروں کی طرح عمل کر کے افلاطون کے قول کی صداقت کو قابلِ فہم بنا دیا جو اس نے جدید ریاست کے ابتدائی زمانے میں پیش کیا تھا۔

پچھلے تین ہزار برسوں میں کئی انقلاب رونما ہوئے، ریاستوں کے خاکے تبدیل ہوئے، حکومتوں کی ہیئتیں بدلیں، ملکوں کے سربراہوں کے ناموں اور عہدوں میں تبدیلیاں آئیں لیکن افلاطون کا ریاستی نظریہ آج بھی جوں کا توں قائم ہے۔

ہندوستان میں سیاست اور فلسفہ کی ہم آہنگی کی سب سے عمدہ مثال سابق صدر جمہوریہ ہند رادھا کرشنن تھے۔ ان کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین صدر رہے اور وہ بھی ادب اور سیاست کا سنگم تھے۔ ارکانِ حکومت میں بھی کئی ایسے لوگ ہیں جو ادب اور سیاست دونوں سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں میں سیّد محمد عثمان عارف نقش بندی بھی شامل ہیں۔ یہ ایک کامیاب شاعر، کامیاب وکیل اور کامیاب نائب وزیر ہیں۔

اگرچہ عارف صاحب عملی سیاست کے دام میں گرفتار ہو چکے ہیں اور بہت ہی معروف زندگی گزار رہے ہیں تاہم وہ اپنے تخلیقی، ادبی ذوق کی پیاس بجھانے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ عارف صاحب کے علمی فن پر اگرچہ میر، غالب، درد، اصغر، فانی، جگر، فراق اور جوش ملیح آبادی کا بہت گہرا اثر ہے لیکن عارف صاحب اپنے معلّم مولوی بادشاہ حسین رعنا لکھنوی سے زیادہ متاثر ہیں۔ رعنا نے نہ صرف اردو اور فارسی زبانوں سے کماحقہ واقفیت بہم پہنچائی بلکہ ان کو لکھنؤ دبستان شاعری کے اصول، رموز اور لسانیاتی نرم روی کی تدریس بھی بہم پہنچائی۔

عارف صاحب نے ابتدائی تعلیم کے مراحل اپنے آبائی وطن سادول ہائی اسکول اور ڈونگر کالج بیکانیر میں طے کئے۔ بی اے کا امتحان آگرہ یونیورسٹی اور ایم اے ایل۔ ایل بی کی سندیں علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ ۱۹۴۶ء میں آپ نے بیکانیر ہی میں وکالت شروع کر دی۔

شاعری اور وکالت عارف صاحب کو ورثہ میں ملی تھیں۔ ان کے والدِ محترم علامہ محمد عبداللہ بیکانیر میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج تھے اور بیدلؔ تخلص کرتے تھے۔ عارف صاحب کے بڑے بھائی حاجی محمد یوسف راسخ بیکانیری تھے۔ جناب بیدلؔ اور جناب راسخ دونوں ہی یادگارِ داغ علامہ بے خود دہلوی کے شاگرد اور مشاق شاعر تھے۔ ان دونوں بزرگوں سے نہ صرف عارف کے ذوقِ شعری کی تربیت ہوئی بلکہ ایک ادبی اور علمی صحت مند ماحول بھی میسّر ہوا۔ اس طرح عارف صاحب جنھیں ایک طرف مولوی رعنا لکھنوی اور دوسری طرف جناب بیدلؔ اور جناب راسخ کی صحبتیں میسّر تھیں ایک ایسے میلانِ فکر و زبان سے روشناس ہو گئے جسے ہم لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کا سنگم کہہ سکتے ہیں۔

جناب عارف لگ بھگ ایک درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تصنیف نذرِ وطن دلوں کو گرما دینے والی وطنی نظموں کا مجموعہ ہے جس پر راجستھان ساہتیہ اکادمی نے ان کو ایک ہزار روپیہ کا انعام بھی دیا تھا۔ ان کی ایک تصنیف عقیدت کے پھول ہے۔ یہ نعتیہ کلام ہے۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے اس عقیدت کا تانا بانا اس عظیم مذہبی مکتب فکر سے پیوست کر دیا ہے جس کو ہم نقش بندی مکتب فکر کہتے ہیں۔ اس تصنیف کے متعلق جسٹس ہدایت اللہ نائب صدر جمہوریہ ہند فرماتے ہیں "عارف صاحب نقشبندی سلسلۂ طریقت سے وابستہ ہیں۔ اس لئے تصوّف کی اعلیٰ قدریں جو انسانی ذہن میں سوز و گداز، رقت اور انسان دوستی کے پرخلوص جذبات پیدا کرتی ہیں ان کے نعتیہ کلام میں موجود ہیں۔ نفسیاتی گہرائی اور گیرائی اُمنگوں اور تمناؤں کا ادراک انھیں نعت گوئی کی بدولت حاصل ہوا ہے"۔

جسٹس ہدایت اللہ صاحب نے "عقیدت کے پھول" کے متعلق جو رائے دی ہے اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوّف اور معرفت کا بیان صرف وہی اہلِ قلم کر سکتے ہیں جو بلاواسطہ یا بالواسطہ تصوّف یا معرفت سے وابستہ رہے ہوں۔ منشی غلام غوث بے خبر جو غالب کے ہمعصر دوست اور اپنے زمانے کے مستند عالم، ادیب اور ماہر لسانیات بھی تھے غالب کی صوفیانہ شاعری کے متعلق

رقم طراز ہیں کہ "غالب کی صوفیانہ شاعری صوفیانہ شاعری کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھتی کیونکہ غالب زحال سے واقف ہیں اور نہ قال سے۔ وہ صوفیانہ مضامین کا بیان کرنے کے لئے صرف سُنی سُنائی حکایات سے کام لیتے ہیں۔"

عارف صاحب حال و قال سے واقف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقشبندیہ طریقت جو ہندوستانی تصوف کی اہم کڑی ہے وہ اس سے عقیدتاً منسوب ہیں اور یہ عقیدت ان کو اپنے اجداد سے ورثہ میں ملی ہے۔

عقیدت کے پھولوں کے علاوہ عارف صاحب کے تین اور مطبوعہ شعری مجموعے "قلم کی کاشت" "ذکر محبوب" اور "دامانِ باغبان" بھی ہیں۔ مزید دو شعری مجموعے زیرِ طباعت ہیں۔

جناب محمد عارف کی زندگی متعدد پہلوؤں کی حامل ہے۔ وہ سیاست داں بھی ہیں، وکیل بھی ہیں اور ادیب بھی۔ ادبی زندگی بھی ان کی اپنے رر ایک پھیلاؤ اور کشش رکھتی ہے۔ وہ صرف بی تخلیقات تک محدود نہیں ہے بلکہ ادبی تنظیم کی ، قائل ہے۔ اس کا اندازہ عارف صاحب کی گوناگوں مصروفیات سے لگایا جاسکتا ہے۔ گذشتہ تیس برسوں سے وہ راجستھان میں اُردو زبان و ادب کے بقا اور ارتقائی تجدید کے لئے سرگرم ہیں۔ انجمن ترقی اُردو ہیکانیر کے زائد از پچیس سال سکریٹری رہے۔ راجستھان ساہتیہ اکادمی کے فعال رُکن ہیں۔

اپنی سیاسی زندگی میں اگرچہ عارف صاحب مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو سے بہت زیادہ متاثر ہیں لیکن جس سیاسی شخصیت نے ان کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ شریمتی اندرا گاندھی ہیں۔

اندرا گاندھی کی نگاہِ تیز ہیں کی بدولت عارف صاحب اپریل ۱۹۷۰ء میں راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے، ستمبر ۱۹۷۱ء میں سرکارِ ہند کے نمائندے کی حیثیت سے یو این او کے ۲۶ ویں اجلاس میں شریک ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں نائب وزیر تعمیرات و مکانات مقرر ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ عارف صاحب وکیل بھی رہے اور سیاست داں بھی ہیں لیکن ان کا اہم ترین مقام اور نشانِ شناخت شاعری ہے۔ وہ جب سیاست داں نہیں تھے اس وقت بھی شاعر تھے۔ اب وہ نائب وزیر ہیں تب بھی شاعر ہیں اور زندگی کی آخری سانس تک شاعر رہیں گے۔

عارف صاحب نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اُنھوں نے طویل نظمیں بھی کہی ہیں، رُباعیاں اور قطعے بھی کہے ہیں مگر بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ غزل کے حسن جمال و اجمال نے صرف عارف کی ادبی زندگی ہی میں نکھار پیدا نہیں کیا بلکہ ذاتی زندگی کو بھی جس میں وکالت اور سیاست کی بوالعجبیاں بھی شامل ہیں ایجاز، نرم روی اور خوش سخنی عطا کی ہے، ان کی تحریر و تقریر میں سنجیدگی اور متانت، فقیرانہ انکسار اور درویشانہ کردار بخشا ہے۔ یہ غزل ہی کا کرشمہ ہے کہ عارف وزیر ہونے پر بھی فقیر ہیں۔ وہ وزیر ہونے پر بھی جس چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں اسی کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے جوں کا توں بیان کر دیتے ہیں۔ مثال کے لئے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

؎ عہدے کا نشہ ہے کہ انا، جھوم رہا ہے
کرسی پہ جو بیٹھا ہے وہی آج خدا ہے

؎ دودھ کے ڈبے پہ آدھی رات سے مجمع لگے
اک پیالی چائے کی یوں صبح لے جاتے ہیں لوگ

؎ اک خون کا سیلاب ہے اک آگ کا دریا
جو امن کی دھرتی تھی وہ مقتل کی زمیں ہے

ان اشعار کو پڑھ کر کوئی گمان بھی نہیں کرسکتا کہ ان کا خالق مرکزی حکومت کا وزیر ہے۔ جب افلاطون نے کہا تھا کہ فلاسفروں ہی کو بادشاہ ہونا چاہئے تو اس کے ذہن میں غالباً یہی بات ہوگی کہ فلاسفر کے یہاں تشکیک بھلے ہی ہو مگر اس کے یہاں جھوٹ نہیں ہوگا، فریب نہیں ہوگا، ریاکاری نہیں ہوگی اور بد دیانتی نہیں ہوگی۔ چونکہ شاعر اور فلاسفر میں کوئی زیادہ بین نہیں ہوتا بلکہ دونوں کا خمیر صداقت اور تلاشِ حق ہی سے اُٹھتا ہے۔ اس لئے اگر ہم افلاطون کے قول میں یوں ترمیم کرلیتے ہیں کہ "شاعروں کو وزیر ہونا چاہئے" تو بے جا نہ ہوگا۔

اب جناب عارف کے کلام کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

رُباعی

طوفان تو اُٹھتا ہی چلا جاتا ہے
سیلاب تو اُمڈا ہی چلا جاتا ہے
انسان کی کشتی کو تیرانے والو
انسان تو ڈوبا ہی چلا جاتا ہے

قطعہ

غم میں سایہ میں زندگی پل کر
کھِل کھِلاتی ہے جگمگاتی ہے
روتی رہتی ہے رات بھر شبنم
صبح پھولوں میں مسکراتی ہے

اشعار

؎ انسانیت کو خون کے آنسو رُلا دیئے
انسان کو اپنی کون سی خوبی پہ ناز ہے

؎ انسان ہیں کہ شہروں میں خوں خوار درندے ہیں
معلوم نہیں ہوتا جنگل ہے کہ بستی ہے

؎ کیسے بوسیدہ روایات کو قائم رکھیں
کیسے گرتی ہوئی دیوار سنبھالی جائے

؎ وہ جسم ہوں جو چوٹ سے تیشے کے نہ ٹوٹے
جو پھول کے لگنے سے ہو زخمی، وہ بدن ہوں

؎ وقت بھی کیسا مصور ہے تری یاد کے ساتھ
کتنی تصویریں بناتا ہے، مٹا دیتا ہے

؎ رویا ہے کون، بہر چمن یہ کسے خبر
پھولوں کی پتیوں پہ تو موتی چمک گئے

؎ نرم خو، شیریں سخن، نازک بدن، رنگیں لباس
اب کوئی ایسا نظر آیا تو کتنا ڈر لگا

؎ کچھ اور چاہتا ہوں تبسم کے ساتھ ساتھ
یہ تو ادائے حسن ہے شانِ کرم نہیں

؎ اک بات پر ہماری اُلجھن میں پڑ گئے تم
دنیا نہ جانے کیا کیا کرتی ہے دوستی میں

؎ نظریں جھکیں تو رنگ سا چہرہ پہ آگیا
اتنا تو اعترافِ محبت ضرور تھا

مظہر ہوشیارپوری
۳/۱۱ - ایم - بی - روڈ، نئی دہلی

رشید احمد شروانی

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

مسلمانوں کی تعلیمی حالت کے بارے میں ٹھوس معلومات پر مبنی مضامین کا سلسلہ رشید احمد شروانی صاحب نے شروع کیا ہے۔ ان کے مضامین عام طور پر ہفت روزہ اور روزنامہ اخباروں میں شائع ہوتے ہیں مگر ان مضامین کی نوعیت وقتی یا ہنگامی نہیں ہوتی۔ ان کی ایک مستقل حیثیت اور اہمیت ہے۔ یہ آج بھی بامعنی ہیں اور بہت حد تک کل بھی بامعنی ہوں گے۔ مگر اردو میں ہفت روزہ اور روزنامہ اخباروں کا سائز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ آسانی سے محفوظ رکھا جا سکے۔ چنگاری کا سائز ایسا ہے کہ اسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے رشید صاحب کے اہم مضامین کو ہم "چنگاری" میں شائع کر رہے ہیں۔

۳۰ر دسمبر ۱۹۸۰ء کو ایک کمیٹی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کی میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے الہ آباد گیا۔ میٹنگ کے بعد وقت ملا تو یو پی بورڈ آف ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے دفتر جا کر ہائی اسکول امتحان کی میرٹ لسٹیں دیکھیں۔ دفتر والوں نے بتایا کہ ۱۹۸۰ء کی میرٹ لسٹ تو ابھی سائیکلو اسٹائل نہیں ہوئی ۱۹۷۹ء کی میرٹ لسٹ ہندی میں ٹائپ کی گئی تھی اور کئی نام مٹے مٹے سے تھے۔ صاف پڑھے نہیں جا رہے تھے۔ میں نے اس میں مسلم بچوں کے نام تلاش کر کے نوٹ کیے۔

ایک بٹا چالیس

میرٹ لسٹ میں چوبیسویں نمبر پر مراد آباد کے نزاکت علی ولد جناب ننھے کا نام ملا جنہوں نے ۴۱۳ یعنی قریب ۸۳ فیصد نمبر حاصل کیے۔ مسلم بچوں میں سارے صوبے میں غالباً یہی اوّل ہیں۔ اس کے بعد میرٹ لسٹ میں میری آنکھیں تلاش کرتی رہیں مگر دو سو چون نمبر تک کسی اور مسلم بچے کا نام نظر نہیں آیا۔ یو پی میں سولہ فیصد مسلمان ہیں۔ آبادی کے تناسب سے پہلی ڈھائی سو پوزیشنز میں سے چالیس مسلم بچوں کے نام ہونے چاہیے تھے لیکن صرف ایک مسلم بچے کا نام تھا۔ یعنی آدھے فیصد سے بھی کم۔ جتنے ہونے چاہیے اس کے ایک بٹا چالیس۔

آئی، اے، ایس میں تو ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان آبادی کے تناسب سے ہوں مگر سب سے پہلے اور اہم ترین بورڈ امتحان یعنی میٹرک کی میرٹ لسٹ میں بھی مسلمان آبادی کے تناسب سے ہونے چاہیے۔ یا نہیں؟

دوسرے مسلم بچے کا نام میرٹ لسٹ میں دو سو پچپن نمبر پر ملا۔ یہ ہیں جھانسی کے رشید خاں ہاشمی ولد جناب اللہ دین خاں جنہوں نے ۳۸۹ یعنی قریب ۷۸ فیصد نمبر حاصل کیے۔ تیسرا نام دو سو پچاسی نمبر پر فتحپور کی ایک مسلم بچی کماری افروز رضوی بنت جناب سید کوثر خاطر کا ملا جن کے ۳۸۷ یعنی ۷۷ فیصد نمبر ہیں۔ چوتھا نام دو سو بانوے نمبر پر سلطان پور کے اعجاز احمد ولد جناب عبدالرؤف کا ملا۔ ان کے نمبر بھی بالکل اتنے ہی ہیں۔ گویا پہلے تین سو ناموں میں صرف چار مسلم بچوں کے نام تھے جبکہ سولہ فیصد آبادی کے تناسب سے اڑتالیس مسلم بچوں کے نام ہونے چاہیے تھے۔

پھر پانچواں مسلم نام میرٹ لسٹ میں تین سو اڑتیس نمبر پر ضلع ایٹہ کے ارشد جمال صدیقی ولد جناب محمد ایوب کا ملا جن کے ۳۸۴ یعنی قریب ۷۷ فیصد نمبر ہیں۔ پہلے چار سو ناموں میں یہی پانچ مسلم نام ملے جبکہ آبادی کے تناسب سے چونسٹھ ہونے چاہیے تھے۔

پھر کہیں جا کر چار سو بائیس نمبر پر الہ آباد کے آفتاب احمد ولد جناب اخلاق احمد کا نام ملا جن کے ۳۸۱ یعنی ۷۶ فیصد نمبر ہیں اور چار سو ترسٹھ نمبر پر ضلع دیوریہ کے منور احمد ولد جناب محمود علی کا نام ملا جن کے ۳۸۰ یعنی ٹھیک ۷۶ فیصد نمبر ہیں بس۔ پانچسو میں سے صرف یہی سات مسلم نام ملے۔ جبکہ آبادی کے تناسب سے اسّی مسلم بچوں کے نام ہونے چاہیے تھے یعنی جتنے ہونے چاہیے اس کے ایک بٹا دس سے بھی کم تھے۔ جس صوبے میں سولہ فیصد مسلمان ہیں وہاں اہم ترین بورڈ امتحان میں (جسے اعلیٰ تعلیم کی انٹرنس یا دروازہ کہا جاتا ہے) ڈیڑھ فی صد مسلمان بھی نہیں۔ کیا غضب ہے۔

غور طلب بات ہے کہ جب تک ہمارے بچے میٹرک ہی میں دیگر بچوں کے مقابلے میں متناسب تعداد میں اونچی پوزیشنز حاصل نہیں کریں گے تب تک وہ آگے یا اور زیادہ اونچے امتحانوں میں دوسروں کے سامنے کیسے ٹک پائیں گے۔؟

جیسا کہ اوپر لکھا ہے میرٹ لسٹ صاف ٹائپ نہیں تھی اور عین ممکن ہے کہ کسی مسلم بچے کا نام رہ گیا ہو جلدی میں نظر نہ آیا ہو یا کسی طالب علم یا طالبہ یا ان کے والد کا نام یا کسی مقام یا کسی بچے کے نمبر غلط نوٹ کر لیے گئے ہوں۔ اس لیے اگر کوئی صاحب ایسی کسی سہو یا غلطی کی اطلاع ہم کو دیں تو ہم شکر گزار ہوں گے۔

مجھے ڈر لگ رہا ہے

ایک اور بھیانک چیز سامنے آئی جس سے بے حد پریشانی ہوئی۔ ۱۹۷۸ء

کی میرٹ لسٹ میں پہلے پانچ سو میں بارہ مسلم بچوں کے نام تھے یعنی ۲٫۴ فیصد۔ مگر ۱۹۷۹ء کی میرٹ لسٹ میں پہلے پانچ سو میں صرف سات مسلم بچوں کے نام تھے یعنی ۱٫۴ فیصد۔ گویا ڈیڑھ فیصد سے بھی کم۔ یعنی مسلمانوں کا تناسب ڈھائی فیصد سے بھی گھٹ کر ڈیڑھ فیصد تک بلکہ اس سے بھی نیچے آگیا۔ تو کیا یوپی میں مسلمان سال بہ سال تعلیم میں پیچھے جا رہے ہیں؟ خدا کرے کہ میرا یہ ڈر غلط ہو اور جب ۱۹۸۰ء کی میرٹ لسٹ سامنے آئے (جو کہ امید ہے اس مہینے کے آخر تک آجائے گی)، تو اس میں مسلم بچوں کے نام زیادہ ہوں۔ لیکن چونکہ دہلی میں دیکھ چکا ہوں کہ تین چار سال پہلے تک مسلمان تعلیم میں ہرسال مزید پیچھے ہو جاتے تھے اس لیے ڈرتا ہوں کہ کہیں یوپی میں اب تک وہی حالت نہ ہو۔

حیران کیوں ہو؟

یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان ہرسال تعلیم میں پیچھے ہوتے جائیں؟ بڑی آسانی سے۔ آج سے کئی سال پہلے یوپی میں صرف دو لاکھ بچے ہائی اسکول کا بورڈ امتحان دیتے تھے۔ ان میں اگر بیس ہزار مسلم بچے تھے تو دس فیصد ہوتے اس کے بعد گاؤں گاؤں اسکول کھلنے شروع ہوتے اور ہائی اسکول بورڈ امتحان دینے والے بچوں کی تعداد چار لاکھ ہوگئی اگر اسی دوران مسلم بچوں کی تعداد چوبیس ہزار ہوئی تو مسلمانوں کا تناسب چھ فیصد رہ گیا یعنی مسلم بچوں کی تعداد بیس ہزار سے بڑھ کر چوبیس ہزار ہونے کے باوجود تناسب دس فیصد سے گھٹ کر چھ فیصد ہو گیا۔

اسی طرح جب تک کل تعداد چھ لاکھ ہوئی مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار ہوئی تو ان کا تناسب پانچ فیصد رہ گیا اور جب تک کل تعداد آٹھ لاکھ ہوئی اور مسلمانوں کی تعداد بتیس ہزار تو ان کا تناسب چار فیصد رہ گیا۔ گویا یوپی کے مسلمان ہر سال کل کے مقابلے میں تعلیم میں پیچھے ہوتے جا رہے ہیں۔

اللہ کرے کہ میرا یہ قیاس یہ ڈر غلط ہو۔ لیکن کون جانے؟ کس نے گِنا ہے؟ کسی اور نے تو قیاس بھی نہیں لگایا۔ میں نے تو صرف ۱۹۷۹ء کی میرٹ لسٹ میں پہلے پانچ سو ناموں میں مسلمانوں کی تعداد صرف سات دیکھی جو کہ ۱۹۷۸ء میں بارہ تھی تو اس ڈر کا اظہار کر دیا کہ ۱۹۸۰ء میں کہیں اور کم نہ ہو گئی ہو۔ اب یوپی کی مائنارٹیز کمیشن یا مرکزی مائنارٹیز کمیشن بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے اور پاس ہونے والے مسلم بچوں کی تعداد معلوم کریں تو صحیح صورت حال سامنے آئے۔ لیکن کسے فرصت ہے؟ کسے غرض پڑی ہے؟ یہ کام کیے بغیر کس کی تنخواہ رکی جا رہی ہے؟

زندگی اور موت

بہر حال جو تعداد کم سے کم اسی ہونی چاہیے وہ اگر ۱۹۷۹ء کے سات کی جگہ ۱۹۸۰ء میں چودہ بھی ہو جاتے تب بھی بہت کم کہی جائے گی۔ یوپی کے مسلمانوں کو تعلیم میں سب کے برابر آنا ہے مسلمان پیچھے رہیں گے تو وہی انجام ہو گا جو اب تک ہو رہا ہے بلکہ اگر سال بہ سال تعلیم میں مسلمانوں کا تناسب گرتا جائے گا تو انجام وہ بھی ہو سکتا ہے جو اب تک نہیں ہوا یوپی کے مسلمانوں کو احساس ہونا چاہیے کہ اپنے بچوں کو تعلیم میں دوسروں کے برابر لانا صرف کوئی شوق کی بات نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہمارے بچے پڑھ گئے تو بڑے افسر بن جائیں گے اور نہ بھی پڑھے تو گھر میں تو دال روٹی ہے ہی۔ جی نہیں۔ اگر ہمارے بچے نہ پڑھے اور کچھ نہ بنے تو ہمارا کوئی پرسان حال نہ ہوگا، ہم کو مانگے پانی نہ ملے گا۔ اگر مسلمان سرکاری ملازمتوں میں نہ آئے تو پھر کئی مراد آباد ہوں گے مسلمانوں کی دوکانیں جلیں گی، گھر لٹیں گے، مسلمانوں کی ہڈیاں توڑی جائیں گی، سر پھوڑے جائیں گے۔ مسلمان کچل کچل کر مریں گے۔

تعلیم پر مسلمانوں کی بقا منحصر ہے تعلیم کے بغیر عزت کی زندگی تو کیا مسلمان شاید ذلت کی زندگی بھی نہ گزار پائیں گے۔

شمالی ہند کے باقی سات آٹھ صوبوں میں کل ملا کر جتنے مسلمان ہیں اتنے صرف یوپی میں ہیں۔ مان لیجیے کہ بہار، مدھیہ پردیش، دہلی، پنجاب وغیرہ میں مسلمان آگے آجائیں مگر یوپی میں مسلمان پسماندہ رہیں تب بھی شمالی ہندستان کے آدھے مسلمان تو پسماندہ ہی رہے اور ان کی وجہ سے بحیثیت مجموعی شمالی ہند کے تمام مسلمانوں کو پسماندہ ہی کہا جائے گا۔ گویا یوپی کے مسلمان خود پسماندہ رہ کر شمالی ہند کے تمام مسلمانوں کو اپنے ساتھ پسماندہ رکھ رہے ہیں —

"ہم تو ڈوبیں گے صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے" والی بات ہے۔

یوپی میں مسلمانوں کی پوزیشن ہر لحاظ سے بہتر ہونی چاہیے۔ ان کی آبادی سترہ فیصد ہے۔ کئی شہر اور قصبوں میں مسلمان یا تو اکثریت میں ہیں یا آدھے سے کچھ ہی کم ہیں۔ مسلمان بڑی آسانی سے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلانے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ لیکن مدھیہ پردیش میں جہاں مسلمان بمشکل چار پانچ فیصد ہیں، کئی مقامات پر مسلم قریب اکیس مسلم اسکولوں میں بحیثیت مجموعی اچھی

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

اُردو کے مزاحیہ کلام کا انتخاب

ارتقا کی ایک خاص منزل پر پہنچنے کے بعد ہی کسی زبان کا مزاحیہ ادب ایک ممتاز مقام حاصل کرتا ہے۔ اردو میں مزاحیہ ادب کی روایت بہت پُرانی ہے اس کا مختصر انتخاب ایک مشکل کام ہے۔ اسی لئے اکبر اور اس کے بعد کے چند شعرا کو اس مختصر انتخاب میں شامل کیا گیا ہے ظاہر ہے یہ کوئی جامع انتخاب نہیں ہے۔ اس کوتاہی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دہلی کے اردو بازار میں مزاحیہ شاعروں کا کلام نایاب ہے مجبوراً جو کچھ دستیاب ہوا اسی پر قناعت کیا گیا ——— (ادارہ)

خواجہ عبدالغفور

تحریف نگاری

اردو نے لفظ پیروڈی کو اپنا لیا ہے۔ میری رائے میں تحریف نگاری ہر لحاظ سے موزوں ہے اور اس سے مفہوم اچھی طرح سے واضح ہو جاتا ہے۔ ایک حرف کی جگہ دوسرے حرف کو بدل کر اصل عبارت کو قائم رکھتے ہوئے سنجیدہ مضمون کو مزاح میں بدل دیا جاتا ہے۔ کبھی دو چار لفظ یا جملے کے جملے بھی بدل دیئے جاتے ہیں۔ اشعار میں کبھی مصرع پورا پورا حذف کر کے دوسرا مصرع جوڑ دیا جاتا ہے اور ہر مصرع کے کچھ لفظ بدل دیئے جاتے ہیں۔ سلسلۂ خیال کو قائم رکھتے ہوئے ایک دو لفظ بدل کر اصل مضمون کو خبط کرتے ہوئے نیا خیال پیدا کیا جاتا ہے۔

تحریف نگاری مزاح کی ایک بڑی دلچسپ صنف ہے لیکن اس کا ادب میں کوئی مقام نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس میں اوریجنل خیال ہوتا ہے اور نہ طرز تحریر۔ جدّت ضرور ہے لیکن کسی اور کے سہارے۔ بہر کیف یہ اصل تصنیف کی بگڑی ہوئی صورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ کسی نہ کسی کے طرز نگارش اور انداز بیان کی تقلید کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اس میں تصرف و تغلب بہت زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ بجویہ تنقید بھی۔ اس کو ایک طرح سے خاکہ اڑانا بھی کہا جا سکتا ہے اور مضحک نقالی بھی۔

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی ٹکلر کی کر خوشی سے پھول جا

ہم اُردو کو عربی کیوں نہ کریں ہندی کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں
جھگڑے کے لیے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں
آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں لیکن اک اکھاڑا قایم ہے
جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشہ کیوں نہ کریں

سن لو یہ بھید، ملک جو گاندھی کے ساتھ ہے
تم کیا ہو؟ صرف پیٹ ہو، وہ کیا ہے؟ ہاتھ ہے!

علوم اُن کے، زباں ان کی، پرس اُن کے، لُغات اُن کے
ہماری زندگی کے سارے اجزا پر ہیں ہات اُن کے!

اکبر الہ آبادی

مزاحیہ کلام کا انتخاب

ریزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب
خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں

پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا
حجاب اُس کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

جو کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر
ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے؟
عام الزام ہے اکبر پہ کہ پیتا ہے کیوں
اس کی پرسش نہیں ہوتی کہ یہ کھاتا کیا ہے

تیزیاں کرتے ہیں قانون بدلنے والے
زحمتیں سہتے ہیں قانون پہ چلنے والے

ایک زمانے میں یہ خواہش تھی کہ جانیں ہم کو لوگ
اب یہ رونا ہے کہ ہم کیوں اس قدر جانے گئے
بولے چپراسی جو میں پہنچا بہ اُمیدِ سلام
پھانکیے خاک آپ بھی صاحب ہوا کھانے گئے
مجھ میں اظہارِ محبت ان میں اظہارِ کمال
میں وہاں رونے گیا اور وہ کہیں گانے گئے

لیڈروں کی دھوم ہے اور فالور کوئی نہیں
سب تو جنرل ہیں یہاں آخر سپاہی کون ہے

تھے معزز شخص لیکن اُن کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درجِ گزٹ باقی جو ہے نا گفتنی

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں　　اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گ
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گ

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی　　اپنی اپنی روش پہ تم نیک ر
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ　　موجوں کی طرح لڑو مگر ایک ر

قطعہ

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبرؔ　　مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں　　نہ جائیں گے و لیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ　　کیا ہے میں نے جس کو زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے　　کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم۔ اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے　　بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی　　کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت　　کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے　　ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی　　مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود　　نہیں منظور مغزِ سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ　　تو استعفا مرا باحسرت و یاس

وفات سر سید مرحوم پر

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

کے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

قطعہ

خواہانِ نوکری نہ رہیں طالبانِ علم
قائم ہوئی ہے رائے یہ اہلِ شعور کی
کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آرہی صدا دُور دُور کی

اقبال

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِّ نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ
دفعِ مرض کے واسطے بل پیش کیجئے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

انجم مانپوری

اندھی نگری چوپٹ راج

انجم مانپوری نے نظم سے زیادہ نثر میں اپنے مزاح کا جوہر دکھایا ہے۔ ان کی تصنیف "میر کلو کی گواہی" کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔

کب تک پنڈت جی مہراج — قرض کی ہنڈیا، بھیک اناج
غلّے کے انبار کے مالک — دانے دانے کو محتاج
راشن کا اسٹاکسٹ اب تو — کل کا بنیا، سیٹھ ہے آج
اونچی اونچی تنخواہیں ہیں — نام کے عہدے، کام نہ کاج
حق تلفی معمول میں داخل — رشوت خوری عام رواج
چوری، ڈاکہ، لوٹ کھسوٹ — یاد آتا ہے برٹش راج
بھوکی ننگی ملک کی بہنیں — اس پر بھی کچھ شرم نہ لاج
جوتے جھاڑنے جن کی گذری — بن گئے ملک کے وہ سرتاج
ملک کو یوں بدنام نہ کیجئے — بھارت کی کچھ رکھئے لاج

دشمن کو مت کہنے دیجئے
"اندھی نگری چوپٹ راج"

بہرِ خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجئے

کچھ تو خلوص کا بھی ثبوت آپ دیجئے
اہلِ قلم کو یوں نہ فقط ڈھاپ دیجئے

کرتے ہیں جو قلم سے مدد بے معاوضہ
خط کا جواب تک نہ انھیں آپ دیجئے

ملنے جو جائیے تو نہ ہو کچھ مخاطبت
دفتر کی راہ جا کے فقط ناپ دیجئے

بے اعتنائیاں ہوں تو مضمون کے عوض
بیٹھے فقط دعا انھیں چُپ چاپ دیجئے

کم بیں ہے گر تو شیشۂ عینک پہ ہے غبار
ہو صاف، گر مجوشی کا گر بھاپ دیجئے

مضمون بھیجنے کا نہ پھر کیجئے گناہ
سر سے اب اپنے ٹال ہی یہ پاپ دیجئے

سمجھیں نہ مانپوری کو اُن میں، جنھیں ہے شوق
"بہرِ خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجئے"

غزل

ایک فلم ایکٹرس کا ادھر اغوا ہونا
شب میں مجھ پر پولس کا نرغا ہونا

یہ مصیبت ہے کہ ہوتا نہیں غصہ پیدا
اور رُکت نہیں اولاد کا پیدا ہونا

کنڑول اب جو غذا پر ہے تو ہو برتھ پہ بھی
پرمٹ ایک اور بھی اب چاہئے اس کا ہونا

ہجر میں جان تو دیدیں ہے مگر غور طلب
پوسٹ مارٹم میرا اور ان کا مچلکا ہونا

زخم دل کا جو کیا ذکر تو ہنس کر بولے
آپریشن ہی سے ممکن ہے اب اچھا ہونا

رات دن کھاتے تھے غم پہلے تھے پیٹو عاشق
اب فقط کافی ہے دو توش، اک انڈا ہونا

وضو خانے سے بڑھ کر ہے ضروری جائے استنجا
کہ اس کی وجہ سے بھی سینکڑوں مسجد میں آتے ہیں

غزل

چیختے چیختے گل کے لیے گلزاروں میں
کانٹے پڑ پڑ گئے بلبل تری منقاروں میں

ڈر سے مہتوں کے یہ ہلچل ہے زمینداروں میں
کہیں دھر لے نہ براہل انھیں بیگاروں میں

لیڈروں میں ہیں نہ داخل نہ رضاکاروں میں
ہیں منسٹر کے فقط حاشیہ برداروں میں

کنٹرول اب رہے غلے کی طرح برتھ پہ بھی
شب کو ہوتی ہے بلیک حُسن کے بازاروں میں

میرا گھر فاقہ زدوں کا ہے اکھاڑا گویا
چوہے ڈنڈ پیلتے ہیں اب مرے بھنڈاروں میں

عشق تن کو نہ روکے گا عصائے پیری
اک اُڑنگا ہے یہ گرتی ہوئی دیواروں میں

جب کہ پیری میں گناہوں کی سکت ہی نہ رہی
بن کے اب پارسا مشہور ہیں دینداروں میں

جوش ملیح آبادی

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

بیوی: نہ تو بنگلہ ہی میسّر ہے نہ موٹر پیارے
زندگی چین سے کٹ سکتی ہے کیوں کر پیارے
نہ تو کپڑا ہے نہ لتّا ہے نہ گہنا پاتا
سوروپلی کوئی تنخواہ ہے، سوچو تو ذرا

شوہر: چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
پھر نہ یہ درد ہی ہوگا نہ یہ آہ جاں سوز
یہ نحوست، یہ فلاکت، یہ ہلاکت یہ وبال
چند ہی دن کا ہے، بس چند ہی دن کا جنجال
اپنے گلزار میں کلیاں ہیں چٹکنے کے قریب
اپنے اقبال کا تارا ہے چمکنے کے قریب
چند روز اور مری جان، فقط چند ہی روز

دلاور فگار

اسٹوڈنٹ کی دُعا

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری
زندگی کھیل میں غارت ہو خدایا میری

فلم میں میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
متوجّہ میری جانب مدھوبالا ہو جائے

زندگی ہو مری نوشاد کی صورت یارب
فلم کی شکل سے ہو مجھ کو محبت یارب

ہو مرا کام بزرگوں کو نصیحت کرنا
سٹھ گئے ہوں جو بزرگ انکی مرمت کرنا

میرے اللہ پڑھائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس پہ نہ چلانا مجھ کو

"مغلِ اعظم" و "برسات" دکھانا مجھ کو
"پرتھوی راج" و "دو انند" بنانا مجھ کو

عمر بھر مست رہوں، کھاؤں پیوں عیش کروں
چیک تو مجھ کو دلا دے میں انھیں کیش کروں

کیا کروں گا میں یہ تعلیم کی دولت پاکر
میرے اللہ بنا دے مجھے جانی واکر

علم کی دولتِ ارزاں مرے قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو "عالم" کی یہ وہ گِل ہی نہیں

ید لاہوری

ڈرن آدمی کے نام

مونچھیں بڑھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
داڑھی منڈھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
مرغے جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
دلیا پکا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور لنچ اُڑا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

وہ بھی ہے آدمی جسے کوٹھی ہوئی الاٹ
وہ بھی ہے آدمی نہ ملا جس کو گھر نہ گھاٹ
وہ بھی ہے آدمی کہ جو بیٹھا ہے بن کے لاٹ
وہ بھی ہے آدمی جو اٹھائے ہے سر پہ کھاٹ
موٹریں جا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
رکشہ چلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دوکانیں سجا سجا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں ٹھیلہ لگا لگا
ہر مال چار آنے کی دیتے ہیں وہ صدا
پولیس ان کا کرتی ہے چالان جا بجا
کیبن بنا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اس کو گرا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

رشوت کے نوٹ جس نے لئے وہ بھی آدمی
دو روز جس نے فاقے کئے وہ بھی آدمی
جو آدمی کا خون پئے ـــــ وہ بھی آدمی
جو پی کے غم کا زہر جئے وہ بھی آدمی
آنسو بہا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مسکرا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

وہ "لالو کھیتوی" ہو کہ ہو "گولی ماروی"
دفتر کا ہو کلرک کہ مسجد کا مولوی
ہو وہ "فقیر خاں" کہ ہو وہ "سیٹھ ٹیوب جی"
وہ بھی ہے آدمی جو کرتا ہے لیڈری
جو بس میں جا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور بس چلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یہ جھونپڑے میں قید وہ بنگلے میں شاد ہے
یہ نامرادِ زیست ہے وہ بامراد ہے
ہر "کالا چور" قابلِ صد اعتماد ہے
یہ "زندہ باد" اِدھر وہ اُدھر "مردہ باد" ہے
نعرے لگا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
چندہ جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

لٹھے کے تھان جس نے چھپائے سو آدمی
پھرتا ہے چتھیڑے سے لگائے سو آدمی
بیٹھا ہوا ہے غلہ دبائے ـــــ سو آدمی
راشن نہ کارڈ پر بھی جو پائے سو آدمی
صدے اٹھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
دھومیں مچا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

راجہ مہدی علی خاں

ایک خاتون کا پرائیویٹ خط

(محبوب کے نام)

میرے محبوب میری کل ہے شادی — میری شادی میں شامل تم بھی ہونا
وہیں گھر میں پڑے سڑتے رہو گے — یہیں آکر پلاؤ کھا کے رونا
ہر اک ارمان کو دے دے کے دھکّے — مرے غم کے سمندر میں ڈبونا
میں دیکھوں تم گزرے کی طرح زرد — نظر آؤں میں پیلی جیسے سونا
ضرور آنا تمہیں میری قسم ہے — نہ اپنی عاشقی کی لاج کھونا
لپٹ جانا مرے شوہر سے آکر — گلے مل مل کے یہ کہہ کہہ کے رونا
سپردم بہ تو مایۂ خویش را — تو دانی حساب کم و بیش را

(ایک سہیلی کے نام)

دل سے تو آہ آہ کئے جا رہی ہوں میں — ہونٹوں سے واہ واہ کئے جا رہی ہوں میں
یوں زندگی گزار رہی ہوں میں ان کے ساتھ — جیسے کوئی گناہ کئے جا رہی ہوں میں
قسمت کے حکم سے مسز اُلّو میں بن گئی — اُلّو سے بھی نباہ کئے جا رہی ہوں میں
اب سوچتی ہوں تجھ کو سکھی "ان" سے بیاہ دوں — "ہموار" تیری راہ کئے جا رہی ہوں میں
مُکّوں کے ساتھ ہی نہیں رغبت مجھے سکھی — چانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہی ہوں میں
دیتے ہیں پہلے زور سے میری کمر پہ لات — اور اس کے بعد کہتے ہیں شانوں پہ رکھ کے ہات
گر کو کر بلند اتنا کہ ہر اک لات سے پہلے — میاں بیوی سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

شوکت تھانوی

مدّوجزر صحافت

گھٹا سر پہ اخبار کی چھا رہی ہے
صحافت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
کتابت پس و پیش منڈلا رہی ہے
چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے
ابھی اور لکھیں حضور ایک کالم
ابھی سے نہ گائیں کہ آجا رے بالم
ابھی سے نہ اپنے کو لوری سنائیں
ابھی اور خبریں ذرا "ترجمائیں"
پئیں چائے خود اور سب کو پلائیں
کہ سب مل کے اک دوسرے کو جگائیں
نمٹنے کا جلدی اگر ہے ارادہ
تو خبریں ہوں کم سرخیاں ہوں زیادہ
خبر ڈھونڈ لیجئے وہ جو چھ کالمی ہو
کہیں جنگ تھوڑی بہت چھڑ گئی ہو
کہیں ریل گاڑی کی ٹکر ہوئی ہو
ہے مطلب کہ تھوڑی بہت سنسنی ہو
صحافت کا اعجاز کچھ تو دکھا دیں
کسی رائی کا آپ پربت بنا دیں

کہیں زلزلہ کوئی آیا ہی ہوگا
کسی نے کوئی شور اُٹھایا ہی ہوگا
کسی نے تو زور آزمایا ہی ہوگا
کسی نے کسی کو ستایا ہی ہوگا
دکھا دیں اسی میں فسانہ طرازی
اسی کو تو کہتے ہیں "اخبار سازی"

کہیں کوئی ہنگامہ برپا ہوا ہو
مشاہیر عالم میں کوئی مرا ہو
کسی رہنما نے بیاں کچھ دیا ہو
ہے مطلب تو اس سے ہمارا بھلا ہو
کسی بات کا ہم بتنگڑ بنا دیں
اور اک موٹی تازی سی سُرخی لگا دیں

روانی قلم کی ذرا تو دکھائیں!
کہ ہو ختم کام اور کاپی لگائیں
بڑی رات آئی ہے اب گھر کو جائیں
کہ جو سو چکے ہیں انھیں بھی جگائیں
گریں اپنے بستر پہ بے ہوش ہو کر
خبر سب کو دیں خود فراموش ہو کر

(اقبالؔ کے مومن کی پیروڈی)

مومن جنت میں

شکوہ ہے فرشتوں کو کم آمیز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے بہت تیز ہے مومن

اس انتخاب میں جن شعرا کی نگارشات شامل ہیں ہم ان کے ممنون ہیں یہ انتخاب ہی نہیں **تلخیص** بھی ہے۔ اس کی وجہ سے بعض شعرا کا کلام پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آیا مگر "کچھ نہیں" سے "کچھ ہاں" بہتر ہے خواجہ عبدالغفور صاحب کے مضمون کا ایک حصہ اور زیادہ تر شعرا کا کلام ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد سے ماخوذ ہے ——— (ادارہ)

رضا نقوی واہی

کیا بود و باش پوچھو ہو یورپ کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
گو آج تیل بیچ رہے ہیں گلی گلی
لیکن کبھی تھے ہم بھی چراغ اس دیار کے

گوپی ناتھ امن

بارش سے دب گیا ہے ٹوٹا مکاں ہمارا
آندھی کا منتظر ہے اب سائباں ہمارا
سیلاب نے کچھ ایسی رنگت ہمیں دکھائی
ہر اک سے پوچھتے ہیں گھر ہے کہاں ہمارا

ضمیر جعفری

غریب خانہ ہمیشہ سے جیل خانہ ہے
مرا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ ہے
دلوں کا فرش بچھا ہے جدھر نگاہ کرو
تمھارا گھر بھی دلوں کا کباڑ خانہ ہے

کنھیا لال کپور

فون پھر آیا دل زار نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرو چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

صادق مولیٰ

کیا یہ سب سچی باتیں ہیں جو لوگوں نے پھیلائی ہیں
صادق مولیٰ دیوانے ہیں صادق مولیٰ سودائی ہیں
اس عشق سے کس کو لابھ ہوا اس عشق میں سچے لوٹ گئے
سنتے ہیں صادق مولیٰ کو پاگل کتنے نے کاٹا ہے

کتابوں کی باتیں

...بیر احمد

...تاب - میں
...اعر - عبداللہ کمال
...ت - ۲۰ روپے
...ے کا پتہ - عصری بک سنٹر
3/1410 رام نگر
...ابدرہ دہلی 32

۱۳ نظموں اور ۴۳ غزلوں پر مشتمل یہ مجموعہ کلام شاعر کی پختہ مشقی اور منفرد فکر و اسلوب کا مظہر ہے۔ ۱۹۷۷ میں جدید شعرا کا اس قدر زور تھا کہ شعری تخلیقات انفرادی کاوش کی بجائے اجتماعی کوششوں کا نتیجہ معلوم ہوتی تھیں۔ اس دورِ بلاخیز میں بھی عبداللہ کمال نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ اس نے کسی کی پیروی قبول نہیں کی اور نہ ہی کسی طرح اس کے کلام پر کسی دوسرے شاعر کا کوئی اثر نظر آتا ہے۔ ویسے وہ یگانہ سے بہت متاثر ہوا مگر اسے اعصاب پر سوار ہونے کی اجازت نہ دی۔ اس کی یگانہ پسندی کا سبب بھی غالباً اس کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت ہے اسی انانیت کے سبب وہ خود پسندی میں بھی مبتلا ہے۔ کہتا ہے ؎

عجیب شخص ہے دھرتی پہ آسمان سا ہے
خدا مقام نہیں پھر بھی لامکان سا ہے
اُگے جو صبح کا سورج تو اک مشین ہے وہ
ڈھلے جو شام تو پھر جسم کی تکان سا ہے
سکوتِ دشت تمنا ہے اس کی جائے پناہ
نواحِ عارض و گیسو میں بے نشان سا ہے
برہنہ رہتا ہے شمشیر بے اماں کی طرح
ہر ایک شخص یہاں اس سے بدگمان سا ہے
اٹھا نہ پائیگا یک لمحہ نشاط وجود
وہ اپنی تیغ نفس سے لہولہان سا ہے
نگاہ دار فلک تا فلک رہا وہ کمال
اور اب زمیں پہ ٹوٹی ہوئی کماں سا ہے۔

یہ وہ کوئی اور نہیں۔ "میں" یعنی شاعر ہے۔ لوگوں کی اس سے بدگمانی بے جا نہیں اس لئے کہ وہ عجیب ہے اور شمشیر بے اماں کی طرح برہنہ بھی رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معاشرے کے آداب اور رسم و رواج کا خیال نہیں رکھتا۔ اسے یہ احساس نہیں کہ کوئی کتنا ہی بڑا فنکار کیوں نہ ہو۔ زندگی سے بڑا نہیں ہے۔ پوری کائنات چند ضابطوں کی اسیر ہے۔ اور انسان تو محض ایک بے حقیقت ذرہ سے بھی بدتر ہے۔

مگر عبداللہ اسے تسلیم نہیں کرتا وہ تو پوری کائنات سے بدگماں ہے۔ وہ خفا ہے اور ناراض ہے حیرتی بھی ہے۔ وہ رسم و رہ عام پر چلنا پسند نہیں کرتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ کہتا ہے ؎

یہ نیک لوگ مگر کیسے جی رہے ہیں کمال
کہ ایک لمحہ کوئی خود کو سوچتا بھی نہیں

عبداللہ اپنی اس خفگی کے سبب سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہے۔ معاشرے کی کج طرز حکومت نظام معیشت کی خامیوں کا اسے احساس نہیں، وجہ یہ ہے کہ اس میں طبقاتی شعور نہیں ہے۔ اس نے ادب کے علاوہ مطالعہ نہیں کیا ورنہ شاید اس کی شاعری میں اتنی تلخی، تندی، بیزاری، خفگی اور حیرت نہ ہوتی۔ بلکہ اس میں سوز اور عرفانِ غم ہوتا۔ شاعر خود کو تنہا نہ سمجھتا بلکہ وہ ان لوگوں کا حامی ہوتا جو اس نظام کو بدلنے کے لئے کوشاں ہیں ـــ

عبداللہ کی شاعری کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک اجنبی بھٹکتا ہوا اس دنیا میں آگیا ہے۔ جس کی فضا اسے راس نہیں آتی شاید اس لئے وہ کہیں ایک جگہ ٹکتا نہیں ہے۔ وہ سخت اضطراب کے عالم میں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شہر در شہر بھاگتا پھرتا ہے۔ مگر اسے ہر شہر نقابوں کا شہر نظر آتا ہے۔ اس کی بے چینی بڑھتی جاتی ہے اسے محسوس ہوتا ہے ؎

لپکتا رہتا ہے شعلہ سا مجھ میں ہر لمحہ
ہے اب تو برف کا موسم ہی سازگار اسے

مگر یہ اس کا وہم ہے۔ برف کا موسم بھی اسے سازگار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے ؎

ریزہ ریزہ مرا تانوں میں اڑتا جائے
کوئی بنجارہ مجھے راہ پہ گاتا جائے

مگر خواہش سے کیا ہوتا ہے۔ کسی بنجارے کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ شاعر کو تانوں میں اڑاتا جائے۔ اس شکستِ آرزو کے بعد یہ محسوس ہونا فطری ہے ؎

"ہر نیا چہرہ نئے زخم لگاتا جائے"

وہ زخم کھاتا ہے لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ یعنی یہ کہ معاشرے سے اس کی کشاکش جاری ہے۔ وہ معاشرے کی پابندیاں قبول کرنے پر تیار نہیں۔ معاشرے سے لڑنے کے اس عمل کو وہ جہاد سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ایسا افسانوی شہزادہ ہے جس کی محبوبیت میں قصہ کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

عبداللہ کی شاعری میں کہیں کوئی تصنع یا شاعری برائے شاعری، شاعری برائے تجربہ یا چونکانے کی کوشش نہیں ہے۔ تجربے تو اس نے بھی کئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

وہ سچ تھا شاید کہ میرے قدموں پہ چاند تارے جھکیں گے۔ اک دن کہ چاند تاروں کو سطح دریا پہ اپنے قدموں میں دیکھتا ہوں
بٹا ہوں بازار مصر میں اب کوئی زلیخا کئی کئی شب کے خواب لیکر ادھر سے گذرے حسنِ یوسف ہوں بک رہا ہوں

عبداللہ کے تجربے اس قدر مختلف انوکھے اور منفرد ہیں کہ عام لوگوں کے لئے بیان کا حدیث ذات نہیں بن سکے۔ نفسی تجربہ آفاقی تجربہ نہیں بن سکا عبداللہ کا تجربہ عام لوگوں کی کون کہے خاص لوگوں کے لئے بھی غیر کا تجربہ رہتا ہے بہت کم ایسے لوگ ہونگے جو عبداللہ کے تجربے یا شاعری کو اپنے دل کی دھڑکن سمجھتے ہوں۔ "میں" کے آغاز میں عبداللہ نے شیلی کا قول نقل کیا ہے "میری شاعری قارئین کے ایک طبقہ کے لئے قابل فہم ہے، چاہے وہ ان حالات و واقعات کے احوالِ واقعی سے واقف نہ ہوں، جن کا اس میں ذکر کیا گیا ہے، ہاں ایک بڑا طبقہ

لندن کا ایک یادگار مشاعرہ

مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ لندن میں اردو زبان اور اردو ادب کی خدمت کرنے والی کتنی انجمنیں قائم ہیں البتہ یقین سے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جتنی انجمنیں اردو ادب کی ہیں شاید کسی اور زبان کے ادب کی نہیں ہیں۔ کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا، جس میں اس وسیع شہر کے کسی نہ کسی گوشے میں "محفل سخن" یا مشاعرہ" نہ منعقد ہوتا ہو، لیکن لندن ہی نہیں، انگلستان کے سارے اردو شعراء اور اہل ذوق حضرات سال بھر حیدرآباد اسوسی ایشن کے مشاعرے کے منتظر رہتے ہیں اس پہ طرفہ یہ ہے کہ ہماری ایسوسی ایشن کو" ادبی" ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں۔ یہ انجمنیں لندن میں حیدرآبادی روایت کو برقرار رکھنے کے خیال سے بنائی گئی ہے اور اس کا مقصد زیادہ تر انگلستان میں مقیم حیدرآبادیوں کی تفریح کا سامان مہیا کرنا ہے۔ شاید اسی وجہ سے حیدرآباد ایسوسی ایشن کے مشاعرے بہت کامیاب ہوتے ہیں ادب کی خدمت حیدرآباد کی قدیم روایت میں داخل ہے اور شعر و شاعری کے بغیر حیدرآبادیوں کی تفریح مکمل نہیں ہوتی، یہ بات لندن میں مقیم حیدرآبادیوں کے باذوق ہونے کی علامت ہے

دو چار باتیں جو حیدرآباد اسوسی ایشن کے مشاعروں کو دوسرے مشاعروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ قابل ذکر ہیں پہلی یہ کہ ایسوسی ایشن کا مشاعرہ وقت پر شروع ہوتا ہے اور وقت پر ختم بھی ہوتا ہے خود میرے بارے میں ایک "ڈاکٹر صاحب" نے جو بدقسمتی سے شاعر بھی ہیں "تشخیص فرمائی ہے کہ مجھے وقت کی پابندی کی بیماری ہے۔ تو اس کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ کاش یہ میرا روگ ایک۔ مرض متعدی بن کر سارے شعراء کو چھو جائے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہمارے مشاعرے میں نہ صرف اچھے شعراء ہی کو مدعو کیا جاتا ہے بلکہ باذوق سامعین کو جمع کرنے کی جستجو بھی کی جاتی ہے ہمارے مشاعروں میں نہ صرف شعراء کو ان کے کلام پر داد ملتی ہے، بلکہ خود شعراء سامعین کی سخن فہمی اور سخن شناسی کی داد دیتے ہیں برجستہ داد سے مشاعرے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اور "تحسین سخن شناس" سے اشعار کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

حیدرآبادی مشاعرے کی مقبولیت کی ایک اور وجہ حیدرآبادیوں کی ایک کمزوری ہی کو لیجیے کہ ہمارے معاشرے میں لذت دہن" کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی شیریں زبان" کی ان مشاعروں میں بھی حیدرآبادی کھانے افراط سے فراہم کئے جاتے ہیں اور انگریزی مقولہ۔

APPETITE OFTITE ART

پر بڑی سختی سے عمل کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں جنابہ مہر نعیم، جنابہ مہر یزدانی، جنابہ ساجدہ صدیقی، جنابہ صغرا عبدالرشید کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

اس سال حیدرآباد کی ایسوسی ایشن کا سالانہ مشاعرہ مہاتما گاندھی ہال میں ۲۱ ستمبر کو منعقد کیا گیا بیرسٹر غلام یزدانی نے جو حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن نے ٹرسٹی ہیں سامعین کا خیر مقدم کیا اور شاعری کی اہمیت پر مختصر لیکن نہایت ہی دلچسپ تقریر کی اور پھر محترمہ زہرہ نگاہ سے درخواست کی کہ وہ مشاعرے کی صدارت قبول فرمائیں۔ شاعروں کو متعارف کرانے کی ذمہ داری بیگم حبیب (صدیقہ شبنم) کو سونپی گئی جسے انھوں نے شگفتہ انداز میں اور خوش اسلوبی سے انجام دیا حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن کا کچھ یہ دستور ہے کہ محفل کے آغاز ہی میں شعراء اور مہمان وغیرہ کا شکریہ ادا کر دیا جاتا ہے اس طریقے کے مطابق ایسوسی ایشن کے سیکرٹری نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ سب سے پہلے اپنی پیاری زبان اردو کے شکر گذار ہیں جس کے ادبی خزانے سے ہم سب کی زندگیاں مالا مال ہیں۔ لندن میں اردو کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ صرف دہلی، حیدرآباد، لاہور اور لکھنؤ ہی نہیں لندن بھی اب اردو زبان اور اردو ادب کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بن جائے

شعراء اور سامعین اور اسوسی ایش کے سب کارکنوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جب بہت ہی سادگی سے یہ اعلان کیا گیا کہ "ممکن ہے کہ ہم آج ایک عظیم شاعر کے کلام سے فیضیاب ہونے والے ہیں"۔ تو سامعین اس اشارے پر چونک گئے۔ فیض احمد فیض لندن آئے ہوئے ہیں۔ کیا وہ اس مشاعرے میں تشریف لائیں گے۔؟ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کہ صرف بڑائی ہانکی جا رہی ہے۔ فیض صاحب بیمار ہیں آج کل کسی مشاعرے میں تشریف نہیں لے جاتے کاش سامعین کو فیض صاحب کے ان آنسوؤں کا پتہ ہوتا۔ جو ایک رات قبل مجھ سے گفتگو کے دوران ان کی آنکھوں سے امنڈ آئے.... میاں میں تمہارے مشاعرے میں کیسے نہ آؤں گا؟ ضرور آؤں گا۔ اپنے مرحوم دوست مخدوم کی خاطر۔ حیدرآباد سے مجھے بڑی عقیدت ہے غرض مشاعرہ ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ فیض احمد فیض تشریف لے آئے اور جب اپنا کلام سنانے اٹھے تو مخدوم کی غزل ؎

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزہ آخر شب

کی طرح پر لکھی ہوئی اپنی غزل سے ہی اپنے کلام کا آغاز کیا۔ چار غزلیں اور تین نظمیں سنانے کے بعد بھی اہل ذوق حضرات کی تشنگی باقی رہی مشاعرے میں ۲۶ مدعو شعراء نے اپنا کلام سنایا، نوجوان پاکستانی شاعر افتخار عارف کی غزل ؎

میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اسکو گھر کر دے

پورا ہال واہ واہ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ چند شعراء کے کلام کا اقتباس پیش کیا ہے۔

اطہر نواز

بزم ادب میں اب یہ زمانہ بھی آئے گا
شاعر غریب ساتھ میں طبلہ بھی لائے گا
سچ ہے کہ فیض فیض ہے مہدی حسن نہیں
طرز حفیظ نور جہاں کی زمیں نہیں
دل کی صدا ہے شعر گلے کی ادا نہیں
یعنے خدا نخواستہ ساحر لتا نہیں
ہم گردش گرداب الم سے نہیں ڈرتے
طوفاں ہے اگر راز کنارہ بھی تو ہوگا

صدیقہ حبیب شبنم

وقت کم ہے کچھ کہو پھر آن کہا رہ جائے گا
زندگی بھر دل میں ورنہ وسوسہ رہ جائیگا

زہرہ نگاہ

ہم خاک بسر جب سے دیکھا تو بہت روئے
سنتے ہیں کہ صحراؤں میں دریا نہیں ہوتے
جاں جیتے ہیں جاں دینے کا سودا نہیں کرتے
منت کش اعجاز مسیحا نہیں ہوتے

عزیز الدین احمد عزیز

اب عشق میں یہ حال ہے کچھ یاد نہیں ہے
اور لب پہ کوئی نالہ و فریاد نہیں ہے
حالات کے زخموں کا نشانہ تو رہا دل
اس پر بھی غنیمت ہے کہ ناشاد نہیں ہے

...ین راہی

وقت کے اجنبی طوق میں باندھ کر
زندگی کو جہاں میں کہاں لے چلے
ہر طرف روشنی ہے نہو کی مگر
روشنی کو جہاں میں کہاں لے چلے
خواب بکھرے ہوئے نیم کی شاخ پر
جو بکھرے ہوئے کہکشاں کی طرح
ایسے عالم میں تنہا مجھے چھوڑ کر
چاندنی میں جہاں کو کہاں لے چلے
پیار کی مورتی پاش ہو کر رہی
من کے مندر کو پھر غزنوی مل گیا
جسم کے جوڑ سے اٹھ رہا ہے دھواں
زندگی کو جہاں میں کہاں لے چلے

خدا جائیو اس پار ندی کے
ہم تو ہے کہتے رہے
سیاں
ہم تو ہے کہتے رہے
ہم نے کہا تھا یہ دھرتی ہے پیاروں کا سپنا
اس دھرتی کے دکھ سکھ سے سب ستیوں کا جینا
تو نے میری ایک نہ مانی نینا بہتے رہے
سیاں
نینا بہتے رہے۔

بقیہ کتابوں کی باتیں

ضرور ایسا ہے جس کے لئے یہ شاعری ہمیشہ ناقابل فہم رہے گی، کیونکہ ان تصورات کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے (میرے اور اس کے درمیان) کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ عبداللہ کی شاعری ایک طبقہ کے لئے ہمیشہ ناقابل فہم رہے گی۔ مگر یہ بڑا طبقہ نہیں ہے۔ بلکہ بہت چھوٹا طبقہ ہے۔

زیادہ تر لوگوں کیلئے عبداللہ کی شاعری قابل فہم ہے۔ مگر وہ عبداللہ کے انوکھے تجربات کا شریک نہیں ہے۔ عبداللہ کی آواز ان سرپھرے نوجوانوں کی آواز ہے جو اس پر فخر کرتے ہیں کہ۔ "میں تو عدم وجود اور وجود دونوں میں اپنی ضد ہوں"۔

عبداللہ کی شاعری ایک سچی شاعری ہے مطلب یہ کہ اس کا تجربہ اپنا اور حقیقی ہے۔ یہ اوڑھے ہوئے جذبات، تجربات اور غیر ہضم مطالعہ کی دین نہیں۔ پھر ان تجربات کو شعر کے پیکر میں اس طرح سے ڈھالا گیا ہے کہ کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ یہ شعری پیکر مختلف تجربات پر مشتمل ایک تجربہ کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اس کے شعروں اور نظموں کا باقاعدہ عضویاتی نمو ہوتا ہے

جہاں کہیں عبداللہ نے ان تجربات کا اظہار کیا ہے، جن میں دوسرے لوگ بھی شریک ہیں۔ یا جن تجربات سے ان کا واسطہ رہا ہے، وہاں اس کی شاعری کی اپیل جان فزا بن گئی ہے۔ مثلاً

کچھ تلخ تھا
سچ ذائقہ
ہر سمت ہے
سنگ صدا
ایک زہر نے
مجھکو پیا
سب جھوٹ ہے
میرے سوا۔

"عبداللہ کمال نے اردو کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس حد تک کہ یہ ادب اس میں رچ بس گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی بے ساختگی سے اس کے یہاں وہ تلمیحات سامنے آجاتی ہیں جن سے آگہی کے لئے کلاسیکی ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ مثلاً۔

وہ نشانہ بھی خطا جاتا تو بہتر ہوتا
آخری تیر نہ لگتا تو میں پتھر ہوتا
یہ کس طلسم نے پتھر بنا دیا مجھکو
کہ میں تو راہ میں پیچھے کہیں مرا بھی نہیں

عبداللہ کے حرف تجربے ہی نئے نہیں ہیں بلکہ اس کی لفظیات اس کا اسلوب طرز بیان بھی نئے ہیں۔ اچھی شاعری کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اپنی تراکیب ہوتی ہیں وہ استعمال شدہ تراکیب تشبیہات اور استعاروں کی جگہ نئی تراکیب، نئی تشبیہات اور استعارے لاتی ہے، عبداللہ کی شاعری میں بھی زبان نئی ہے، فرسودہ اور پامال نہیں۔ مثلاً لبو لپک رہا ہے، میں سفر گیر تھا موسم قفس نقشاب خو شخوابیا اس مجموعہ میں ایک طویل نظم بھی ہے۔ "نقابوں کا شہر"، یہ نظم اردو کی بہترین نظموں میں ہے۔ اور عبداللہ کی پوری شخصیت اور کمال فن کی مظہر ہے

المختصر "میں" ایسا شعری مجموعہ ہے جو آج کے حساس، باغی اور گم کردہ راہ انسان کی بہترین ترجمان ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ناقدین نے اس بہت اچھے شاعر کو نظر انداز کر کے خود اپنے اور اردو ادب کے ساتھ زیادتی کی ہے

علی عباس حسینی

میلہ گھومنی

کانوں کی سُنی نہیں کہتا، آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعہ کا بیان نہیں، اپنے ہی دیس کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے، جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر بھی چاہے رکھئے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سُننا۔

دو بھائی تھے چنو منو نام، کہلاتے تھے پٹھان۔ مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھا، اور ددھیال سید واڑے میں۔ ماں، پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آئی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لئے اور نتیجے میں ہاتھ آئے چنو منو۔ وہ تو یادگاریں چھوڑ کر جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتنا پڑا بڑے میر صاحب نے۔ انہوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنو منو کی پرورش کے لئے کچھ روپے دئے۔ وہ دونوں پلے اور بڑھے، اچھے ہاتھ پاؤں نکالے، چنو ذرا سنجیدہ تھا، ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور میر صاحب کا مصاحب بنا۔ منو لاابالی تھا، اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑتا اور نام کے لئے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انہوں نے چنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر باندھ دیا۔ مگر منو چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی، چمار ٹولی، جولاہے ٹولی ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انہوں نے عاجز آکر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ وہ جب گھونگھٹ لگائے، لجاتی، سمٹتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آکر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا۔ اس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔

اس نے آہستہ سے کہا:

"تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ ہی چنو کی طرح اسے بھی کسی ناند سے لگا دیجئے۔"

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قسم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی نھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی

اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے رہے۔

اتفاق سے انہی دنوں دُور کی کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی بی نے شکل صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹکی بھی ہے۔ سیدانی بی ان درزی کی حرکات سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے رحیمانہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا:

"اچھا! گھر میں رہو اور کام کرو۔ دو چار دن میں تمہارے لئے کوئی بندوبست کروں گی۔"

اُدھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے لووارد کی خبر دی۔ ایک صاحب نے جو ذرا ظریف طبع بھی تھے ان کی تاریخ یوں بیان کی:

"راویانِ صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی، ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کبڑن، کبڑن سے درزن اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔"

ایک صاحب نے پوچھا: "اور اس کے بعد؟"

وہ دونوں شانے اٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے "خدا ہی جانے! شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔"

میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت جز بز ہوئے۔ "اس سیرت کی عورت اور شرفاء کے گھر میں۔ وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلہ میں سامنے آئیں۔" میر صاحب بل کھانے لگے۔ "نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر انکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اسے معصیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں بسا دیتے ہیں تو گھر میں ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔ کہیں چنو منو کی نسل اور نہ بڑھے۔" ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منو کی ماں کو بلا کر انہوں نے ایسے نادر شاہی حکم دے دیا کہ "ہم نے منو کی نسبت سے کہہ دو اس کو کہہ دو کل اس کا عقد ہوگا۔"

بیچاری جولاہن کو چون وچرا کی مجال نہ تھی۔ وہ "بہت اچھا" کہہ کے ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالنے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی اس لئے بہت کھل کے باتیں ہوئیں۔ جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی لیکن جانتی تھی میر صاحب کی خوشنودی اسی میں ہے۔ اختلاف کا یارا نہیں۔ رہنے کا ٹھکانا انہی کا دیا ہے، چنو کی نوکری انہی کی عطا کردہ ہے اور منو کی جوت [illegible] بھی انہی کے ہیں۔ پھر نفع بھی تھا اپنی خوشی سے شادی کریں گے تو سارا خرچ بھی خود ہی اٹھائیں گے۔ غرض گھر آئی اور اس نے رات کو منو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا، جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔ منو کو نئی دھوتی، نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا۔ دلہن کو شاہانہ جوڑا اور چند چاندی کے زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منو کے حوالے کر دیئے اور دلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

وہ بیتتے گئے۔ دن بیتتے گئے، مہینے ہوئے، ایک سال ہونے کو آیا مگر منو اور اس کی دلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی جھٹکے میں اچھے ہو گئے ——— کہ دفعتاً ایک دن بی جولاہن روتی بسورتی پہنچیں معلوم ہوا منو نے مارا ہے۔ پوچھ گچھ سے کھلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہے اور جس طرح وہ نشہ بیوی پر اتارتا ہے اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھڑی میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی سے تو فریاد کرنے آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک ہو سکے، شاید بری عادت نہ چھٹنے پاتی، جولاہن سوائے ماتم کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انہوں نے حکم دے دیا: "آج سے یہیں رہو۔ گھر جانے کی ضرورت نہیں۔"

مگر میر صاحب کو منو کی فکر ہو گئی۔ خون، گندی نالی میں بہہ کر تو بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا ادھڑ جائے گا۔" ساتھ ہی پاسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ "اب اگر منو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا۔" غرض منو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی ——— اور تاڑی بند ہو گئی ——— نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی ——— اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد، سوکھا ہوا آم ہو گیا اور کھانسی بخار کا شکار ہوا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں ——— اور منو کی بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دئے تو انہوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گذری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھلتی ہے۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس بھی کسی سے کم نہیں، انہوں نے کلہ بہ کلہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن تو نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ جوانی و بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ منو پلنگ سے جھپٹ کے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر دو لات ماری کہ وہ ہانپتے کر کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمارداری میں مشغول رہیں۔ لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر قبر میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا۔ بین ہونے لگے اور ساس بہو میں اس پر مقابلہ تھا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ روز تو اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آکر سمجھانا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سیلاب غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے تنکے کا پانے اور رشتہ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتاً جنو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منو کی بیوہ کو عدت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقع سے جنو غم غلط کرنے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس جا بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ درد دل بیان ہوئے، تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح سرخروئی سے ہوئی تو جنو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنا دے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انہوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرما دیا۔ بڑی بی دیر تک ایک وکیل کی طرح بحث کرتی رہیں۔ پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں "چل اے گھر چل۔ مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا۔ وہ اب تیری بیوی ہے، دل خوش، ہرا خدا خوش!" ——— جنو نے ماں کا کہنا کیا۔ مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دیا اور

اپنے چاروں بچوں سمیت اسی گھر میں منتقل ہو آیا۔

ایک مہینہ بیتا، دو مہینے، تین مہینے بیتے مگر چوتھے مہینے چنو کی کمر میں اچک آ گئی۔ اکڑتا، بڑبڑاتا، تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ محسن میر صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے، ان کو دکھایا۔ انہوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دن اور چلا۔ بدقسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس اچنو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا مگر افیون کی خشکی نے دبوچا اور بی چنیا بیگم ہانکتی ہیں دودھ، مکھن، گھی، ملائی اور یہ چیزیں چار روپے کی ملائی ہیں کہاں نصیب، وہ لگا کھیسے نکال کے۔ ممو بیبیا نے اور بیٹیں کھانے۔ مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا بھاویں نہ سماتا اور افیون کی لت پڑ ہی چکی تھی وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر چھلنی کیا اور چنو خان کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے ہی والے تھے کہ چنو کو اختلاج شروع ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلے میں حاضر تھا۔ ڈیا برتن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا اسی کے سر پر بجلی گری۔ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ سنبھل کر اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑتا تھا۔ بے ساختہ "ارے ماں! ارے ماں!" چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا مگر پاؤں پہیے کی طرح لڑھک رہے تھے۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا اکڑا لگا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا، سنبھلتا، پھسلتا، لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بکری کے پنجے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بدھ سے گر پڑا اور اسی طرح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔

بیوی "ارے کیا ہو گیا لوگو!" کہتی ہوئی روڑی۔ چنو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا:

"اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟" اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

چنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کنبہ کا بید گھونسے الہ آباد چلی گئی۔

شہر آشوب

ڈاکٹر یعقوب عامر

میرا انداز، مضطرب اظہار
میری آواز، سبزۂ گفتار
میرا ظاہر لباس میں خفتہ
میرا باطن حواس میں بیدار
ذہن کا باغ دم بہ دم تازہ
قلب کا داغ مستقل آزار
قہقہے میرے دل کی جاگیریں
زخم افسان میرے دل کا خار
سوزِ ہستی مری رگوں کا لہو
نغمۂ زیست خود میرے اشعار

سن رہا ہوں زمانے بھر کی کراہ
دیکھتا ہوں حیات کو بیزار
گھٹ رہا ہے سکون کا سایہ
بڑھ رہا ہے ہوس کا کاروبار
ہر طرف خوف، ہر طرف دشمن
ہر طرف ظلم، ہر طرف عیار
بوالہوس، بے حیا، نرا شیطان
آدمی [illegible]، آدمی مکار

میری عقلی، وطن کا مستقبل
میری تعمیر، قوم کا کردار
میرا ارمان، رونق ہستی
میرا آدرش، گلشن بے خار
میرا قصہ، عوام کی حالت
میری افتاد خود مرا گھر بار

سوچتا ہوں کہ پھر قیامت کیا؟
کیا نہیں ہے یہ حشر کا بازار
کیسے لاؤں سخن میں خوش رنگی
کیسے کہلاؤں آج خوش گفتار
کیسے کہہ دوں کہ کھل اٹھا ہے چمن
کیسے کہہ دوں کہ ہے وطن گلزار

بشیر احمد

سرسید احمد سے انٹرویو

یہ انٹرویو ۱۹۷۱ء میں سیکولر ہندوستان مظفرپور کے لئے ترتیب دیا گیا تھا سوالات کی زبان میری ہے، مگر جواب سرسید کی مختلف تحریروں سے حاصل کئے گئے ہیں ان کی زبان میں کوئی کمی یا اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔

بشیر احمد

یہ وہ جگہ ہے جہاں عقیدت، احترام، خوف وجھجک سے لوگوں کی زبانوں میں لکنت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہاتھ اور قلم کا رشتہ ٹوٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے یہ کسی حاکم اعلیٰ کا دربار نہیں۔ کسی شہنشاہ کی بارگاہ نہیں۔ یہ اس محسن اعظم کی قیام گاہ ہے جس نے اس وقت جب ظلمت کی خوفناک عفریتیں ہندوستانیوں کو نگل جانا چاہتی تھیں۔ ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کی دست گیری کی اس وقت جب مسلمانوں کی ذہنی، معاشرتی اور پستی انتہا کو پہونچ گئی تھی زندگی جوئے رواں کی بجائے منجمد تالاب بن گئی تھی۔ سرسید احمد خاں نے ایک نئی راہ دکھائی سید الاخبار کی مضمون نگاری سے لے کر ایم۔ او۔ کالج کے قیام تک وہ ہمیشہ ہندوستانی قوم خصوصاً مسلمانوں کی علمی، تہذیبی اور معاشرتی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ یہ اسی جامع حیثیات، قلندر صفت سلطان کا مسکن ہے جس کی مسلمہ قابلیت، ہمہ گیر صلاحیت بے لوث قومی ہمدردی اور بے باک صداقت نے انہیں مصلح قوم اور مجدد وقت بنا دیا تھا۔ جس کی تحریروں اور تقریروں نے ہر شعبہ ہائے معاشرت میں انقلاب کی لہریں پیدا کر دیں۔ انہیں غدار، کافر، نیچریہ اور دہریہ بھی کہا گیا اور محسن قوم بھی غدر کے بعد جب انگریزوں نے جہاں آباد کا تعلق جو اس وقت ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ کا تھا۔ دینا چاہا تو انھوں نے ایک حقیر شے کی طرح قدموں سے ٹھکرا دیا اپنے احساسات قلبی کو کچھ دنوں بعد الفاظ کے جامہ میں اس طرح مقید کیا۔

"میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق کوئی دنیا میں نہ ہوگا۔ کہ قوم پر تو برباد ی ہو اور میں اس کی جائیداد کے تعلقہ دار بنوں میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ اب ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ سچ بات تھی میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا چند روز میں اسی غم میں رہا آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مرادآباد آیا جو ایک بڑا غمکدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشے عافیت جا بیٹھوں نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیئے۔ اور جو بھی مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔

میں سرسید کی باتیں بغور سن رہا تھا۔ حالانکہ وہ موجود نہ تھے۔ اور نہ ان کی قیام گاہ تھی۔ مگر میرا تصور مجھے ان کی قیام گاہ میں دیکھ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہیں۔ میں نے پوچھا۔

س:۔ آپ کچھ مضطرب نظر آرہے ہیں؟

ج:۔ کیا کروں وقت کم ہے اور کام بہت، اگر ایک کام پر متوجہ ہو جاتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں۔ کاش مجھے اتنی قوت ہوتی کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو وسعت دے سکتا۔"

س:۔ حضور آپ کا تو ہر کام ہی عظیم ہوتا ہے آپ کی پہلی تصنیف آثار الصنادید ہی کیا کم ہے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس کی تصنیف کی طرف کیوں متوجہ ہوئے۔؟

ج:۔ آثار الصنادید کی تالیف کا مقصد اپنے اسلاف کی یادگار کو نمایاں کرنا تھا۔ کیونکہ کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے۔

س:۔ لیکن آپ ان لوگوں کی حمایت کرتے ہیں جو ہمیں حقیر سمجھتے ہیں۔ ایسا کیوں؟"

ج:۔ انصاف کا مقام ہے کہ جب ہم اپنے سے کمتر اور ناتربیت یافتہ قوموں کو حقیر مثل جانور کے خیال کرتے ہیں تو جو قومیں ہم سے زیادہ شائستہ اور تربیت یافتہ ہیں، اگر وہ بھی ہم کو اسی طرح حقیر اور ذلیل مثل جانور کے سمجھیں تو ہم کو کیا مقام شکایت ہے۔

ہاں! اگر ہم کو غیرت ہے تو ہم کو اس حالت سے نکلنا اور اپنی قوم کو نکالنا چاہیئے۔

س:۔ غالباً اسی قسم کے مقاصد کے تحت تہذیب الاخلاق، کا اجراء عمل میں آیا؟

ج:۔ اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی معزز اور مہذب قوم کہلا دیں۔

س:۔ سویلیزیشن یا تہذیب سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج :۔ سوسیلیزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق و معاملات اور معاشرت تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہونچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے

س :۔ آپ نے بار بار قوم کا ذکر ہے اس لفظ سے آپ کی کیا مراد ہے ؟

ج :۔ لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے ۔ یہی وہ معنی ہے جس سے میں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں

س :۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندو اور مسلمان الگ الگ قومیں ہیں ۔

ج :۔ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ۔ ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں ۔ اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں ۔

س :۔ کچھ فرقہ پرستوں کا خیال ہے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک ہے ۔ آپ کا کیا خیال ہے ۔ ؟

ج :۔ صدیوں سے ہندو اور مسلمان یہاں آباد ہیں ۔ چند دن سے خدا کی مرضی یہ ہوئی کہ ایک تیسری قوم بھی یہاں آموجود ہوئی (اشارہ انگریزوں کی طرف ہے) اب یہ تینوں کا ملک ہے ۔

س :۔ آپ نے بعض اوقات ہندو اور مسلمان کی جگہ اہل ہنود اور اہل اسلام کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں ۔ آخر کیوں ؟

ج :۔ ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں بلکہ ایک شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے ۔

س :۔ جب آپ ہندو مسلمانوں کو ایک قوم سمجھتے ہیں تو آخر ۔ ایم ۔ اے ۔ او کالج کے قیام کا مقصد کیا ہے ؟

کیا یہ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں کھولا گیا

ج :۔ اس مدرسہ کے جو تعلیم کے قواعد بنائے ہیں ۔ ان کے موافق ہندو اور مسلمان دونوں اس مدرسہ میں تعلیم پائیں گے ۔ اس کے بانیوں کا مقصد ہندوستان میں علم اور روشن ضمیری پھیلانے کا ہے ۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ۔ ہندوستان کی دونوں قومیں یعنی ہندو اور مسلمان دونوں برابر ترقی کریں اور علم و ہنر سے فیضیاب ہوں ۔

س :۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کالج کا قیام ہندوؤں اور مسلمانوں میں امتیاز ظاہر کرنے کے لئے عمل میں آیا ہے ۔

ج :۔ مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے خاص سبب جو اس کالج کے قائم کرنے کا ہوا یہ تھا کہ جب میں یقین کرتا ہوں آپ واقف ہیں کہ مسلمان روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جا رہے ہیں ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہیا کی گئی تھیں اسی وجہ سے یہ امر ضروری قرار پایا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جائے اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے ۔ فرض کرو دو بھائی ہیں جن میں ایک بالکل طاقتور اور تندرست ہے دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی زوال پر ہے پس اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہے کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کو مدد دیں ۔

..... میں اس بات سے خوش ہوں کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں ۔ کالج کے تمام حقوق جو اس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہلاتا ہے بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں ۔ جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے ۔ ہندو اور مسلمان کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ۔

س :۔ کیا مسلمانوں کو اپنی الگ تنظیم بنانی چاہیئے ۔

ج :۔ تم اس بات کو جانتے ہو گے کہ ہندوستان کی ترقی کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ اہل ہنود اور اہل اسلام باہم ملکر کام کریں ۔ جب تک یہ نہ ہوگا اس ترقی کو جو ایک قوم کرے گی ہم ہندوستانیوں کی کامل ترقی سے تعبیر نہیں کریں گے ۔

س :۔ اگر آپ ہندو اور مسلمان کو ایک سمجھتے ہیں تو پھر کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کے ہمیشہ خلاف کیوں رہے

ج :۔ (حقوق) کا حاصل ہونا تعلیم پر موقوف ہے جب تمہاری تعلیم پوری ہوگی اور صحیح تعلیم تمہارے دلوں میں بیٹھے گی تو خود تمہارے دل میں ان حقوق کا خیال پیدا ہوگا جو تم واجبی طور پر گورنمنٹ سے پا سکتے ہو ..... اس وقت ان پولیٹیکل معاملات میں ہنگامیوں سے دوستی پیدا کرنا اور ان کے ساتھ شامل ہونا مضرت کا باعث ہوگا

س :۔ گو آپ کے نزدیک کانگریس کی تحریک ہنگامیوں کی تحریک ہے پھر ہمیں کیا کرنا چاہیئے

ج :۔ ہماری غریب رائے میں عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنی خواہشوں اور رجحانوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنے کے لئے وکلا مقرر کرنے کی اجازت دی جائے ۔ یعنی ایک پارلیمنٹ بنائی جائے جس کے ممبر ہندوستان کے ہر فرقہ کے لوگ ہوں اور ان ممبروں کی رائے سے ہندوستان کے تمام لوگوں کے عام خیالات اور حالات بخوبی معلوم ہو سکیں بالفضل شاید یہ تدبیر ایک خیالی معلوم ہوتی ہوگی ۔ مگر درحقیقت یہ ایک ایسی تدبیر ہے جو ایک نہ ایک دن یہی تدبیر یا ایسی ہی اور کوئی بالضرور عمل میں آئے گی ۔ وہ دن آئے گا جب تم خود قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کرو گے صرف ایک چیز چاہیئے یعنی تربیت و لیاقت بس تم دیکھو گے کہ ہندوستانیوں کو علوم و فنون تربیت و لیاقت میں ترقی کرنے کی کس قدر ضرورت ہے ۔

س :۔ گویا حقوق کے حصول کے لئے دباؤ اور زور سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

ج :۔ کسی دباؤ اور زور سے اس چیز کو حاصل نہیں کر سکتے جو آپس کی محبت اور دوستی سے حاصل ہوتی ہے میں علی گڑھ کی مثال دوں گا وہاں ہندو اور مسلمانوں میں اتفاق تھا۔ تین برس دسہرہ اور محرم ایک ساتھ گذر گیا اور کسی شخص نے نہ جانا کہ وہاں کیا ہوا۔

س :۔ لوگ آپ کو نیچریہ کہتے ہیں کیا واقعی آپ کو اسلام پسند نہیں۔

ج :۔ اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں۔ جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی انسانیت اور تہذیب اور رحمدلی کو کمال کی حد تک پہونچانے والی ہیں مگر ہم کو اپنی بہت سی رسوم اور عادات کو جو اگلے زمانہ میں مفید تھیں مگر حال کے زمانے میں مضر ہو گئیں ہیں چھوڑنا چاہیئے۔

س :۔ قرآن شریف کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں۔؟

ج :۔ میں خدا کے کلام کو اس کی صفت سمجھتا ہوں۔ اور تمام صفات خدا کو قدیم مانتا ہوں۔ اور اس لئے خدا کے کلام کو بھی قدیم مانتا ہوں۔ مگر جنیوں اور کرامتوں سے اس بات میں مختلف ہوں کہ خدا کے کلام میں آواز ہے اور اہل سنت والجماعت کے اس مسئلہ سے مختلف ہوں کہ صرف معانی قائم بالنفس ہیں اور وہی درحقیقت کلام ہے اور وہی غیر متغیر ہے بلکہ میرے نزدیک لفظ اور معانی دونوں غیر متغیر ہیں۔ . . . .

. . . . . اور ہم قرآن مجید کو اس معنی کر مع معانی اور لفظ خدا کا کلام کہتے ہیں اور قدیم تصور کرتے ہیں۔

س :۔ گویا آپ عقل کو رہنما بنانا چاہتے ہیں آپ کے نزدیک عقل کا مفہوم کیا ہے۔

ج :۔ انسان میں ایک ودیعت الٰہی جس کو عقل انسانی یا عقل کلی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ہوتی ہے اور اسی ودیعت سے انسان چند واقعات وقوعی مقدمات ذہنی سے ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اور جزئیات کے تتبع سے کلیہ بناتا ہے۔ یا کلیہ سے جزئیات کا حاصل کرتا ہے اسی سے ایجاد اشیاء کی حقائق علوم وفنون سے واقفیت ہوتی ہے۔ دل میں خالق کے جزا سزا کا خیال پیدا ہوتا ہے۔

س :۔ آپ کی اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مادیت کے پرستار ہیں لیکن کیا آپ کے نزدیک مادہ قدیم اور تمام اشیاء کی علت اوّل ہے۔

ج :۔ نہیں ہم مادیات کے سلسلہ میں دریافت کرتے کرتے اوپر چلے ہیں اور آخر کو یعنی سب کے بعد مادہ کا وجود قرار دیا ہے اور یہ ہم کو مطلق معلوم نہیں ہے کہ اس سے اوپر کیا معمولات تھے یا ہیں جن کی تغیر حالت مادہ کے لئے علت ہوتی ہے۔

س :۔ آپ کا کوئی خاص پیغام۔

ج :۔ میں نے بار بار کہا ہے اور ایک بار پھر کہتا ہوں کہ جس طرح ہندوؤں کی شریف قومیں اس ملک میں آئیں اسی طرح ہم بھی اس ملک میں آئے ہندو اپنا (اصل وطن) بھول گئے اپنے دیس کے پردیس ہونے کا زمانہ ان کو یاد نہیں رہا اور ہندوستان ہی کو انھوں نے اپنا وطن سمجھا اور یہ جانا ہمالیہ اور بندھیاچل کے درمیان ہمارا وطن ہے ہم کو بھی اپنا ملک چھوڑے سینکڑوں برس ہو گئے ہم نے بھی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا اور اپنے سے پیشتر قدموں کی طرح ہم بھی اس ملک میں رہ پڑے بس اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے ہندوستان کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے جینے میں دونوں کا ساتھ ہے ہندوستان میں رہتے سہتے ہم دونوں کا خون بدل گیا ہے دونوں کی رنگیں ایک سی ہو گئی ہیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے سے مشابہ ہو گئی ہیں مسلمانوں کی ہندوؤں نے سینکڑوں رسمیں اختیار کر لی ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں۔ یہاں تک کہ ہم دونوں آپس میں اس طرح ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی اور ان کی پس اگر ہم اس حصے سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے۔ قطع نظر کر لیں تو درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں بہ اعتبار ہم وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کے نفاق اور ضد وعداوت اور ایک دوسرے کی بدخواہی سے ہم دونوں برباد ہونے والے ہیں۔

اے میرے دوستو میں نے بار بار کہا اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی دو خوب صورت اور رسیلی آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے۔ تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانی ہو جائے گی۔ پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں اب تم کو اختیار ہے چاہے تم اس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہے کانا۔

اگر آج سرسید ہوتے تو شائد وہ حامد صاحب اور طلباء سے بھی یہی کہتے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک دلہن کی مانند ہے جس کی دو خوبصورت اور رسیلی آنکھیں طلبا اور اساتذہ ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو کانی ہو جائے گی۔ پس اے علی گڑھ والو طلبا اور اساتذہ اب تم کو اختیار ہے چاہے تم اپنی دلہن کو بھینگا بناؤ چاہے کانا۔

●

فلک یک مطلع خورشید دارد بہر شوکت
ہزاراں مطلعہا دارد گریبانِ کہ من دارم

معین اعجاز

بات کا بتنگڑ

نوٹ: تمام واقعات اور مقامات فرضی ہیں لیکن اشعار قطعی "فرضی" نہیں۔ شعرائے کرام کی "احادیث دلبری" کی ان بھونڈی تفسیروں سے ان کے احباب اور لواحقین بددل نہ ہوں کہ یہ سراسر دروغ گوئی پر مبنی ہیں۔ م۔ا

اختر الایمان

بمبئی میں ایک بار اختر الایمان کی ملاقات یوپی کے ایک گریجویٹ بے کار نوجوان سے ہوئی۔ وہ نوجوان بے حد مخلص، ایماندار اور ذہین تھا۔ اختر الایمان صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے کہ وہ "خاشاک عالم" پھونک ڈالنے کا عزم رکھتا تھا۔ انھوں نے اسے اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنا کر اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہا۔ نوجوان نے ان کی یہ پیشکش فوراً قبول کر لی۔ اب وہ ہر جگہ سائے کی طرح ان کے ساتھ ہی رہتا۔ جہاں کہیں بھی وہ جاتے وہ بھی ان کے ساتھ جاتا۔ اس کی ذہانت اور بے پناہ خلوص کے پیشِ نظر اختر الایمان صاحب اس کی بہت ساری باتیں برداشت کر لیتے۔

ایک بار انھیں بڑی پریشانی ہوئی۔ ایک فلم پروڈیوسر نے اپنی ایک نئی فلم کی کہانی کے سلسلے میں ان سے کچھ پرائیویٹ قسم کی گفتگو کرنا چاہی۔ اختر الایمان صاحب کئی بار اس کے گھر گئے لیکن اس نوجوان کی موجودگی میں پروڈیوسر ان سے کوئی بات نہیں کر پاتا تھا۔ اختر الایمان اس نوجوان کو چند لمحوں کے لیے بھی علیحدہ نہیں کر پاتے تھے کہ اس طرح "آبگینوں" کو "ٹھیس"

لگ جانے کا خدشہ تھا۔ بالآخر پروڈیوسر نے ایک بار جھلا کر کہا "بھئی یہ کون لڑکا ہے؟ اسے آپ منع کر دیجیے کہ ہماری "پرائیویٹ گفتگو میں بے وجہ مخل نہ ہو"

اختر الایمان صاحب ایک لمحہ رک کر بولے۔

نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے، جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

شہریار

علی گڑھ میں "اشرف المخلوقات" قتل و غارتگری میں مصروف تھے۔ آئے دن چھرے بازی اور بم پھٹنے کی واردات، شہری پریشان اور ہراساں تھے۔ شہر کے خاص خاص علاقوں میں کرفیو نافذ کر دیا جاتا تھا۔ ایسے میں ایک بار شہریار صاحب رات کے وقت ایک کرفیو والے علاقے میں جا نکلے۔ اچانک ڈیوٹی پر تعینات ایک کانسٹبل نے انھیں روکا۔ انھوں نے ہاتھ اٹھا دیا اور پھر اسے اپنا کرفیو پاس بھی دکھایا۔ کانسٹبل نے معذرت طلب کی اور انھیں چھوڑ دیا۔ کچھ دور جا کر شہریار صاحب نے محسوس کیا کہ کوئی ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ انھوں نے بھاگنا شروع کیا۔ سانس پھولنے لگا۔ بالآخر وہ تھک گئے اور کھمبے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو محسوس ہوا کہ انکا تعاقب کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ ان کا سایہ تھا۔ دوسرے دن جب وہ یونیورسٹی پہنچے تو اپنے دوستوں کے سامنے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

شاذ تمکنت

شاذ تمکنت ایک بار راجستھان کے ایک ریگستانی علاقے میں تنہا بھٹک رہے تھے۔ جگہ جگہ کانٹے دار جھاڑیاں اور ببول کے پیڑ تھے گرمی سے برا حال تھا۔ شاذ صاحب کی شیروانی گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھی۔ پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے لیکن وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر یہ مصرعے گنگنا رہے تھے۔

اب آؤ آ کے امانت سنبھال لو اپنی
تمام عمر کا یہ رتجگا تمام ہوا
میں تھک گیا ہوں مجھے نیند آئی جاتی ہے

اتفاق سے ادھر سے اونٹ گزرا جس کی پیٹھ پر دو تین آدمی سوار تھے۔ انھوں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو انہیں بڑا رحم آیا ان میں سے ایک نے کہا "سائیں جی! آپ کہاں سے آتے ہیں؟ کہاں جائیے گا؟ آئیے ہم آپ کو یہاں سے لے چلتے ہیں"

شاذ صاحب نے جانے سے انکار کیا اور کہا۔

میں وہ آبلہ پا ہوں نجد دکن کا
ببولوں سے جو خوں بہا مانگتا ہے

اونٹ سوار انھیں مجذوب سمجھ کر آگے بڑھ گئے۔

فلمی مبصّر

پرکھ

فلم "شعلے" سے سپّی فلمز کے فلم سازوں کی دھاک فلم بینوں پر ایسی بیٹھی تھی کہ ان کی آنے والی فلم "شان" سے متعلق انھوں نے یہ رائے قائم کر رکھی تھی کہ "شان" بھی فلم شعلے جیسے ریکارڈ قائم کرے گی لیکن "شان" منظرِ عام پر آئی تو فلم بینوں کو جس مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اس کی توقع کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ فلم کے کچھ حصّے کافی جاندار ہیں، کئی سیٹ بہت ہی پُر کشش ہیں لیکن پھر بھی سپّی سے جو اُمیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں ان کے یہ فلم بالکل برعکس ہے۔

"شان" کے بعض مناظر دیکھ کر تو یہ یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے کہ وہ ہالی وُڈ کی کسی فلم سے کاٹ کر اس میں جوڑ لئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ سلیم، جاوید کی اپنی ہی پُرانی فلموں کی نقل "شان" کی کہانی وہی ہے جو آج کی ہر تیسری فلم کی ہوتی ہے۔ نہ صرف شتروگھن کا کردار فلم میں زبردستی ٹھونسا گیا محسوس ہوتا ہے بلکہ پوری فلم ہی علیحدہ علیحدہ حصّوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ پہلا حصّہ سنیل دت کا ہے، پھر امیتابھ بچن اور پھر ششی کپور کا حصّہ ہے جس میں ان کی مجموبائیں پروین بابی اور ربندیا گوسوامی کی دھوکہ دہی کے کارنامے ہیں، تیسرے حصّے میں نئے اداکار مظہر خاں کو اپاہج کے روپ میں پیش کیا گیا ہے، چوتھے حصّے میں شتروگھن سنہا اپنے فلم میں موجود ہونے کی اہمیت ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ پانچویں حصّے میں کل بھوشن کھربندہ بمبئی سے تین سو میل دور سمندر کے ایک جزیرے میں بستی کل پرُزوں کا جادو دکھا کر فلم بینوں کے دلوں میں دہشت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

موسیقی نہ صرف کام چلاؤ ہے بلکہ کہیں کہیں تو کانوں کو ناگوار گزرتی ہے۔ ایک دو گیتوں کے علاوہ تمام ہی گیت زبردستی ٹھونسے گئے ہیں۔ کُل بھوشن جب مکالمے ادا کرتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ وہ کسی ڈرامے کے اسٹیج پر بول رہا ہے۔

ہیما مالنی

سنیل دت

مجموعی طور پر "شان" میں شور شرابے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ اگر اس فلم کو دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ سپّی فلمز نے فلم بینوں کو کچھ دینے کے بجائے صرف ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ عوامی اصلاح اور سماجی بُرائیوں پر ضرب لگانے کے لئے فلم میں کچھ بھی تو نہیں ہے بس اگر ہے تو صرف یہ کہ فلم سازوں نے ہر ہر قدم پر فلم بینوں کو بیوقوف بنائے رہنے کا خاص خیال رکھا ہے مگر افسوس کہ وہ اس میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔

فلم ساز ایم گنگوا این جیٹھوانی اور خالد سمیع کی فلم 'کنھیّا' کی کہانی میں کچھ بھی نیا پن نہیں ہے۔ اسی موضوع پر پہلے بھی کئی فلمیں بن چکی ہیں جن میں یتیم بچّوں کے مسئلوں کو اپنے اپنے ڈھنگ سے فلمایا گیا۔ موضوع پُرانا ہے لیکن فلم کے کچھ موضوع دل کو چھو لینے والے ہیں۔

کنھیا اپنی جوان ماں جو بیوہ تھی، کے ساتھ کھیڑا گاؤں نام کے ایک چھوٹے گاؤں میں رہتا تھا۔ اس کی ماں محنت مزدوری کر کے اپنے لاڈلے بیٹے کو پالتی پوستی تھی۔ اس سے بے حد پیار کرتی تھی تو سالہ کنھیا اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کرتا تھا۔ ایک دن اس پر سے ماں کا سایہ اُٹھ گیا۔

گاؤں والے کنھیّا کو اب یتیم خانے میں بھیج دیتے ہیں۔ پھر معصوم بچّے پر ظلموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک دن کنھیّا یتیم خانہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور بمبئی پہنچتا ہے جہاں انسان نہیں بلکہ پتھر ہے۔

خالی جیب، بھوکا پیاسا اکیلا کنھیا جلد ہی وہاں ایک چوروں کے گروہ میں پھنس جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے کنھیّا کی زندگی میں سونا نام کی ایک لڑکی روشنی بن کر آتی ہے۔ یہ سونا مادھو سنگھ کی رکھیل ہے اور پیار بھری زندگی کے لئے ترس رہی ہے۔ سونا اور کنھیا ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے ہیں۔

امجد خاں نے اپنا وہی روپ ایک بار پھر دہرایا ہے۔ اس کی اداکاری میں کوئی خاص بات نہیں۔ نصیر الدین شاہ اپنی اداکاری با اثر ڈھنگ سے نبھا گیا۔ اس نے اپنی اداکاری کا لوہا منوا لیا۔

آشا سچدیو سے ہدایت کار کام ہی نہیں لے سکا۔

(باقی صفحہ پر)

جھروکے

● ہندوستانی فلموں کی مشہور ہیروئن شبانہ اعظمی اور کہانی کار جاوید کی شادی کی خبر پچھلے دنوں کافی گرم تھی لیکن بعد میں شبانہ اور جاوید نے اس خبر کی تردید کر دی۔ اس سلسلہ کی دلچسپ بات یہ ہے کہ جب جاوید نے شبانہ سے اپنی شادی کی خبر کی تردید کی تو اس نے شبانہ کو شبانہ کہنے کے بجائے "مُنّی" کہا جس کا شبانہ نے بہت بُرا مانا۔ شبانہ کا کہنا ہے کہ جاوید کو اسے "مُنّی" نہیں کہنا چاہئے تھا کیوں کہ اس کے گھر والے تو اسے اس لئے مُنّی کہتے ہیں کہ ان کی نظروں میں وہ ابھی تک چھوٹی سی بچّی ہی ہے اور ان کی زبانیں اسے منی ہی کہنے کی عادی ہو چکی ہیں مگر جاوید کے لئے وہ مُنّی نہیں ہے، پوری جوان عورت ہے۔

اپنی شادی کی اس افواہ کے سلسلہ میں شبانہ اعظمی اخبار نویسوں سے بھی اتنی ناراض نہیں جتنی کہ فلم ہیروئن ریکھا سے ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جاوید سے اس کی شادی کی جھوٹی خبر کو ہوا دینے والی ریکھا ہے مگر "امراؤ جان ادا" کے سیٹ پر جب غصّے سے بھری ہوئی شبانہ نے ریکھا سے اس شرارت کی وجہ جاننی چاہی تو وہ افواہ پھیلانے کا ذمّہ دار جیا بھادری کو گردانتی ہوئی سیٹ سے چلی گئی۔

ہمارے فلمی نمائندے کو خاص ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دراصل یہ خبر خود شبانہ ہی کی منہ سے پھیلی ہے اور وہ اس طرح کہ شبانہ سے کسی نے پوچھا تھا "کیا آپ کی شادی ہو گئی؟" اس کے جواب میں شبانہ نے نہ جانے کیا سوچ کر گھبراہٹ میں کہہ دیا "ہاں.... ہو گئی — تم کو کیا یاد نہیں دوگی۔؟" بس شبانہ کے منہ سے نکلی ہوئی اتنی سی بات پر جاوید سے اس کی شادی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ شبانہ نے تو صرف اتنا ہی کہا تھا کہ "شادی ہو گئی" تو پھر جاوید سے ہی اس کی شادی کی خبر کیوں پھیلی تو.... شائد اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک عرصے سے شبانہ اور جاوید کے رومانس کے چرچے ہو رہے تھے۔

لوگ کہتے ہیں کہ محبّت کا بھوت اور خون سر چڑھ کر بولتے ہیں مگر انتہائی تعجّب کی بات ہے کہ آج شبانہ اور جاوید محبّت کے اس رشتے سے بھی منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ محبّت تو درکنار ان میں تو دوستی تک نہیں ہے۔

اپنے قارئین کی دلچسپی کے لئے یہ بھی بتا دیا جائے کہ جاوید اور شبانہ دونوں ہی بینڈ۔ اسٹینڈ پر ایک دوسرے کے اس قدر قریب پڑوسی ہیں کہ دونوں کے گھروں کے درمیان صرف ایک دیوار کا ہی فاصلہ ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ "ایمان دھرم" کے بعد سے دونوں میں بات چیت بند ہے۔

● فلم "قدرت" کئی مہینوں سے تیار پڑی ہے لیکن ریلیز نہیں ہو پا رہی ہے جس کی وجہ ہدایت کار چیتن آنند کو بتایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ہدایت کار چیتن آنند اور فلم ساز بی ایس کھنّہ میں کئی ماہ سے کسی بات پر جھگڑا چل رہا ہے اور اس جھگڑے سے فلم ساز کو اب تک تقریباً ۵ لاکھ روپے کا نقصان ہو چکا ہے۔ پہلے یہ فلم مارچ، اپریل ۸۰ء میں ریلیز ہونے والی تھی اور اس نمائش کے پیش نظر اس کی پبلسٹی بھی شروع کر دی گئی تھی مگر چیتن آنند کی وجہ سے فلم ریلیز نہ ہو سکی تو فلم ساز کا وہ روپیہ بھی ضائع گیا جو اس نے فلم کی پبلسٹی کے لئے خرچ کیا تھا اور اس روپے پر فائنسر کا سود الگ بڑھتا جا رہا ہے جو اس نے فائنسر سے فلم بنانے کے لئے قرض لیا تھا۔

ہمارے سُراغ رساں نے اطلاع دی ہے کہ چیتن آنند اور بی ایس کھنّہ کے اس جھگڑے کی وجہ پریہ راج ونش کو بتایا جا رہا ہے — ہدایت کار پریہ کا رول بڑھانا چاہتا تھا لیکن فلم ساز اس بات کے حق میں نہیں تھا کہ پریہ کا رول بڑھایا جائے۔ یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ نہ صرف فلم لیٹ ہو گئی بلکہ اب یہ فلم اس وقت تک نمائش کے لئے پیش نہیں کی جا سکے گی جب تک کہ چیتن آنند اور بی ایس کھنّہ کے باہمی اختلافات دور نہ ہو جائیں۔

● راج کمار اور پریم ناتھ اپنی بدمزاجی اور شراب نوشی کے معاملے میں بہت بدنام ہیں لیکن شائد آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ راج کمار کے مقابلہ میں اب پریم ناتھ کافی سُدھر گیا ہے۔ گذشتہ دنوں گذرے دنوں کے اداکار اور گلوکار سریندر ناتھ نے اپنے گھر پر ایک کاکٹیل پارٹی کا اہتمام کیا تھا جس میں پریم ناتھ نے بھی حصّہ لیا لیکن لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ گھڑا رکھ کر پینے والا پریم ناتھ برائے نام ہی شراب پی رہا تھا جب آوارہ گرد نے اس سے پوچھا تو اس نے اس کی وجہ راج کمار کو بتایا۔ اس نے بتایا کہ یہاں تو وہ تھوڑی بہت پی بھی رہا ہے مگر جہاں راج کمار آتا ہے وہاں وہ شراب نہیں پیتا۔

ہوا یہ کہ ایک پارٹی میں دو چار پیگ انڈیلنے کے بعد راج کمار نے پریم ناتھ سے کہا۔ "پریم ناتھ تم خود کو کیا سمجھتے ہو۔؟" پریم ناتھ نے ایک لمحہ اس کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد جواب دیا "میں نے تو اپنے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں" بات آئی گئی ہو گئی مگر اس کے اگلے دن راج کمار نے اپنی گستاخی کی معافی مانگ لی۔ راج کمار کی اس تبدیلی پر پریم ناتھ حیران سا رہ گیا مگر بعد میں اس نے سوچا کہ پینے سے انسان کتنا بہک جاتا ہے، کتنا بدحواس ہو جاتا ہے کہ وہ کسی کی توہین کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا اور اس نے اس وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ پینے کے معاملے میں احتیاط سے کام لینا ہی اچھا ہے۔

بقیہ پرکھ

ٹائیٹل اداکاری میں ماسٹر راجو کی تعریف کی جانی چاہئے۔ فریدہ جلال معمولی رہی۔ دیو کمار رتن سیٹھی نے بھی معمولی اداکاری کی ہے۔

●

بقیہ جاپان چلو

تین بجا رہی تھی۔ ہم بڑے ابن الوقت ہیں لہٰذا فوراً اپنی گھڑی کو جاپانی وقت کے مطابق کر لیا۔ پھر اس مقام پر پہنچے جس کے بارے میں بشارت دی گئی تھی کہ وہاں کوئی ہماری راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا ہوگا۔ جب ہم اسکیلر سے دوسری منزل پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک جاپانی دوشیزہ ہماری تصویر کو سینے سے لگائے ہر مسافر کو بڑی بے تابی کے ساتھ تاک رہی ہے۔ ہمیں اس کی یہ بے تابی بہت بھلی لگی۔ جیسے ہی اس کی نظر ہم پر پڑی اس نے اپنی کمر کو دوہرا کیا۔ اور ساٹھ درجے کا زاویہ بنا کر ہمارے آگے تعظیماً جھک گئی۔ ہم نے کہا "کمبنوا" (جاپانی میں شام کا سلام) وہ بولی "آپ حسین سان ہیں" (جاپانی میں سان "صاحب" کو کہتے ہیں) ہم نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو بولی "میں مس کورا ہوں۔ یونیسکو کی جانب سے آپ کے استقبال کے لئے آئی ہوں" ہم نے کہا "تو پھر کرو ہمارا استقبال" وہ بولی "کچھ دیر توقف کیجئے۔ ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈیولپمنٹ ڈویژن کی سربراہ مسز آسانو بھی آپ کے استقبال کے لئے آئی ہیں۔ وہ دوسری طرف آپ کو دیکھنے گئی ہیں"

تھوڑی دیر بعد مسز آسانو بھی آگئیں اور ہم ٹوکیو گرین ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ناظرین کرام۔ ٹوکیو میں ہماری پہلی رات کا حال آپ بعد میں جانیں تو اچھا ہے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔

بقیہ علی گڑھ اور ترقی پسند تحریک

خواجہ احمد عباس اور اختر انصاری جیسے ذہین اور خلاق طالب علم بھی تھے جنہوں نے ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد رکھی لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے فوراً بعد علیگڈھ میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا قیام عمل میں آگیا تھا۔ جس کے پہلے جلسہ میں علی سردار جعفری نے "جدید ادب اور نوجوانوں کے رجحانات" کے عنوان سے مضمون پڑھا تھا جسے بعد میں جاں نثار اختر نے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے مجلہ میں شائع کیا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام معین احسن جذبی، پروفیسر مونس رضا، پروفیسر رئیس احمد اور کچھ دوسرے نوجوان بھی مارکسزم اور اشتراکیت کے حامی تھے۔ آزادی کے بعد جب ڈاکٹر ذاکر حسین علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو فرقہ پرست اور رجعت پسند طاقتوں کو صدمہ پہنچا طلبا اور اساتذہ دونوں اس زمانہ میں ترقی پسند نظریات کی طرف جھکے۔ سلطان نیازی، قاضی سلیم، ظفر امام خلیل الرحمٰن اعظمی، انجم اعظمی، شہاب جعفری، باقر مہدی اور دوسرے نوجوان ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے میں پیش پیش تھے۔ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے قید و بند کی اذیتیں بھی برداشت کیں۔ چھٹی دہائی میں ڈاکٹر عبدالعلیم، آل احمد سرور ڈاکٹر محمد حسن، قمر رئیس، راہی معصوم رضا اور قاضی عبدالستار بھی علیگڈھ پہنچ گئے۔ قمر رئیس 'علیگڈھ میگزین' اور ماہ نامہ ادیب کے اڈیٹر بھی رہے۔ اس زمانہ میں علیگڈھ کی تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں میں ترقی پسندوں کو غلبہ حاصل رہا۔

نصف صدی میں جن شاعروں اور ادیبوں نے اردو زبان و ادب کی نمایاں خدمت انجام دی ان میں اکثریت ایسے ادیبوں اور تخلیق کاروں کی ہے جن کی تربیت کا گہوارہ علیگڈھ رہا ہے۔

بقیہ شاید کہ

تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بہار میں تو چالیس مسلم ہائی اسکولوں کے تعلیمی معیار بحیثیت مجموعی کچھ اور بھی بہتر نظر آتے۔ دہلی میں بھی رفتہ رفتہ مسلمانوں نے تعلیم میں آگے بڑھنا شروع کیا ہے۔ مگر یوپی کے مسلم ہائی اسکولوں میں سے دو تہائی تو اپنے رزلٹ ہی نہیں بھیجتے۔ بہ مشکل ایک تہائی مسلم ہائی اسکولوں میں سے کچھ غنیمت ہیں باقی دو تہائی کی حالت تشویش ناک ہے۔

مسلم ہائی اسکولوں کا ذکر میں بار بار اس لیے کرتا ہوں کہ جب ہم اپنے ہی اداروں میں اپنے بچوں کی تعلیم چوپٹ کریں گے تو پھر کسی اور سے شکایت کس منہ سے کر پائیں گے؟ یوپی کے دس ہزار ہائی اسکول تو ہمارے اختیار میں نہیں۔ لیکن یوپی کے قریب ایک سو چالیس مسلم ہائی اسکول (دو انٹر کالج) تو ہمارے (یعنی مسلمانوں) کے اختیار میں ہیں۔ کم سے کم ان سب میں تو مسلم بچوں کی تعلیم اچھی طرح ہو۔

یہ کاروانِ ہستی ایسا تیز گام ہے کہ جو اس کے ساتھ اسی کی رفتار سے نہ چل سکا وہ اپنی جگہ کھڑا بھی نہ رہ سکے گا۔ وہ دوسروں کے پیروں تلے کچل جائے گا۔ آج ہمیں صرف زندہ رہنے کے لیے آگے بڑھنا ہوگا۔ ترقی کیے بغیر ہم زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔ ●●

قانون

کہا جاتا ہے کہ قانون اندھا ہوتا ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہرہ بھی ہوتا ہے۔ مجھے اس کے اندھے پن یا بہرہ پن سے فی الحال کوئی غرض نہیں۔ میں ان سطور کے ذریعے قارئین سے یہ گذارش کرتی ہوں کہ وہ حکومت پر زور دیں کہ قانون کی یا کم سے کم ایسے قوانین کی جن سے عام لوگوں کا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ عام تشہیر ہو۔ عام لوگوں کو معلوم تو ہو کہ ان کا کون سا فعل جرم ہے اور اس کی سزا کیا ہے؟ ایسے فعل کی بنا پر کسی کو سزا دینا جس کا مرتکب یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کا یہ فعل 'جرم' ہے۔ عجیب سی بات ہے۔ اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ وہ قانون کی واقفیت عام کرنے کے لئے پروپگنڈہ مشنری کا استعمال کرے۔

کچھ تو ہنسئے

اصلی گالیاں

تقسیم سے قبل لاہور سے دہلی کے لئے رات کو گاڑی چل کر
تقریباً دو بجے بھٹنڈہ پہنچا کرتی تھی۔ لاہور میں گاڑی میں سوار
ہوتے ہوئے ایک مسافر نے گارڈ سے کہا مجھے بھٹنڈے
اتار دینا اور اگر سوتے میں میرے منہ سے گالی وغیرہ نکلے
تو خیال نہ کرنا۔ گاڑی کے گارڈ نے جو سردار جی تھے کہا
اجی فکر نہ کرو۔

صبح جب گاڑی دہلی پہنچی تو لوگوں نے دیکھا
کہ وہی مسافر گارڈ کو بری طرح گالیاں دے رہا ہے جس
پر لوگوں نے گارڈ سے دریافت کیا "سردار جی کیا
بات ہے" یہ کیوں اس طرح گالیاں دے رہا ہے؟

گارڈ نے جواب دیا "اپنی تو نوکری ہی ایسی ہے
اصلی گالیاں تو وہ دے رہا تھا جس کو میں نے بھٹنڈے
اتارا تھا۔

مرسلہ: شہاب زیدی

مثالی بیوی

فرانسیسی سیاست داں رابرٹ
شوما تمام عمر کنوارا رہا۔ ایک
موقع پر کسی اخبار کے نمائندے نے ان سے اس ازلی
کنوارے پن کی وجہ معلوم کی۔ "کیا آپ نے کبھی ایک
مثالی بیوی کی تلاش ہی نہیں کی یا آپ کو ایسی بیوی مل
نہ سکی۔؟

شوماں نے جواب دیا تلاش بھی کی تھی اور
مل بھی گئی تھی مگر وہ خود ایک مثالی شوہر کی تلاش
میں تھی۔

مرسلہ: اختر علی رحیم یار خاں

بہت خوب

تو آپ تین قسم کے چشمے
استعمال کرتے ہیں۔ مہمان
نے پروفیسر سے پوچھا۔

پروفیسر "جی ہاں" ایک دور کی نظر کا ہے،
دوسرا نزدیک کی نظر کا، اور تیسرا ان دونوں کو
دیکھنے کا۔

مرسلہ: مقبول احمد

چاندی کا پانی

ایک دانشور جو اپنے ایک
امیر مگر کنجوس دوست
کے فلیٹ میں بیٹھا ہوا تھا اسے بورژوائی ذہنیت کے
بارے میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن امیر آدمی
اس دقیق فلسفہ کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ آخر دانشور
اپنی جگہ سے اٹھا اور امیر دوست کو کھڑکی کے قریب
لے جا کر کہا کہ وہ کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر بتلائے
کہ باہر بازار میں کیا دکھائی دے رہا ہے۔

امیر آدمی نے کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر
کہا۔

"آدمی ہی آدمی"

اس کے بعد دانشور نے اپنے امیر دوست
کو الماری کے قدِ آدم آئینے کے سامنے لے جا کر پوچھا۔
"اچھا اب تمھیں کیا دکھائی دے رہا ہے"
امیر دوست نے مسکراتے ہوئے کہا "بس
میں خود دکھائی دے رہا ہوں"

اس کے بعد دانشور نے امیر دوست سے
مخاطب ہو کر کہا دیکھو کھڑکی کا شیشہ بھی شیشہ ہے
اور الماری میں لگا ہوا شیشہ بھی شیشہ ہے۔ فرق صرف
اتنا سا ہے کہ الماری کے شیشے پر چاندی کا پانی چڑھا
ہوا ہے جس کی وجہ سے آر پار نظر نہیں آتا بلکہ خود اپنا
ہی چہرہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح جب تمھاری آنکھوں
پر چاندی کا پانی چڑھ جاتا ہے تو تم دوسروں کو
نہیں دیکھ سکتے صرف خود کو دیکھ سکتے ہو۔ اسی کو
کہتے ہیں بورژوائی۔ اب بورژوائی کا مطلب
سمجھ گئے نا۔؟

مرسلہ: محمد عمر خاں

بے ایمان

ایک لڑکا جس کی عمر پانچ سال
کی ہو گی، باغ کی ایک بنچ پر
اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا ہوا مزے سے سگرٹ پی رہا تھا۔
مجھے سخت حیرت ہوئی اور میں نے بڑی بی سے
گذارش کی کہ وہ اپنے بیٹے کو اس عادت بد سے روکیں،
وہ بڑی بے نیازی سے بولیں۔ "اے بیٹا کیا کروں
اس کا تو ایمان خراب ہے۔

مرسلہ: مختار الزماں

CHINGARI (Fortnightly) Regd. No. D (DE) 939
410/3, Ram Nagar Shahdra, Delhi-110032
egistered with the Registrar of News Papers of India R.N. No. 36930/80

قارئین کرام

چنگاری کا تازہ شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اگر یہ پسند آئے تو تعریفی و توصیفی خطوط بھیجنے بجائے ۳۰ روپے بھیج کر خریدار بن جائیے۔ اگر آپ چنگاری کے ساتھ ساتھ اسی ادارے سے نکلنے والے ماہانہ پرچے "عصری آگہی" کی خریداری بھی قبول فرمائیں گے تو پانچ روپئے کی رعایت دی جائے گی۔ عصری آگہی کی سالانہ خریداری کے لئے ۲۵ روپے دینے پڑتے ہیں۔ دونوں کی خریداری قبول کرنے والوں سے صرف ۵۰ روپے لئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہم اپنے خریداروں کو ان پسندیدہ کتابوں کی خرید پر خصوصی رعایت بھی دیتے ہیں۔

اہل قلم

حضرات سے گذارش ہے کہ آپ بھی خریداری قبول فرما کر ۳۰ روپے ارسال فرمائیں تاکہ آپ کی تخلیقات کی اشاعت پر ہم آپ کو معاوضہ بھی دے سکیں۔ ہم بغیر معاوضہ کوئی تخلیق شائع نہیں کرنا چاہتے مگر یہ تبھی ممکن ہے جب ہم سے اعزازی کاپیاں نہ لی جائیں۔

ہم ایک بار پھر اہل قلم حضرات سے درخواست کرتے ہیں کہ تخلیقات کی بلا معاوضہ اشاعت اور اعزازی کاپیوں کی جاگیردارانہ روایت ختم کرنے میں ہم سے تعاون کریں۔

ہمارے پاس دو ہزار ادیبوں کی فہرست ہے اگر وہ حضرات ۳۰ روپے سالانہ خریدار کے لئے ہمیں ارسال کر دیں تو پھر ہمیں ان کی تخلیقات کا معاوضہ دینے میں آسانی ہوگی۔

ادارہ